کہاں گئے وہ لوگ
حزیں کاشمیری

حرفِ گفتنی

مدت ہوئی ایک دن میری دکان پر جناب چودھری ریاض احمد تشریف لائے۔ حال احوال پوچھا، باتیں کیں پھر باتوں ہی باتوں میں فرمانے لگے "معین صاحب! آج کل آپ کے ادبی مشاغل کیا ہیں؟" بندہ نے جواب دینے کے بجائے اپنی آپ بیتی کے تحریر کردہ چند اوراق ان کے سامنے رکھ دیئے۔ وہ اُدھر مسودہ پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔کوئی نصف گھنٹہ بعد پھر میری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا "یہ کتاب کب تک مکمل ہو جائے گی" میں نے کہا "ابھی تو اِس کا آغاز کیا ہے"۔ اِس پر فرمایا "اول تو یہ کتاب آپ ضرور تحریر کریں گے اور دوسرے جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے"۔ میں نے ہامی بھر لی۔ ایک بار میں نے اپنے دیرینہ دوست اور کرم فرما جناب حکم قریشی ایڈووکیٹ سے بھی اپنے اس ارادے کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس کی پُر زور تائید کی۔ آپ جب بھی ملتے مجھے اس کام کی تکمیل پر ابھارتے رہتے۔ خواجہ اختر وائیں (لاہور کے مشہور چٹنی، اچار، مربہ والے) سے بھی جب اپنے اس منصوبے کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بھی حوصلہ بڑھایا۔ اُدھر ڈاکٹر ناظر حسن زیدی مرحوم بھی اِس کام میں مستعد رہنے کی تلقین کرتے رہے۔ اِن تحریکات کے پیشِ نظر بندہ نے اپنی مختصر سی سرگزشت چند ہی روز میں مکمل کر لی۔ پھر سوچنے لگا کہ کیوں نہ اُن بلند پایہ اربابِ علم و ادب کے خاکے ورطۂ تحریر میں لاؤں جن سے ملاقاتیں کیں، جن کی صحبتیں اٹھائیں، جن سے فکر و فن و شعر و ادب میں استفادہ

کیا، جن کی رعنائی خیال نے ایوانِ قلب و نظر میں روشنی کی شمعیں جلا دیں۔ جن کے انداز و اطوار سے شائستگی و تہذیب کے نئے باب کھلے، جن کے نطق، ریگ زارِ حیات پر شبنم افشانی کرتے رہے، جن کے قدم قدم پر نویدِ منزلِ نو اور جن کے نفس نفس میں حیاتِ تازہ کی بشارت تھی۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں ایسے حضرات کے خاکے لکھنے پر مستعد ہوگیا اور یکے بعد دیگرے سبھی خاکے قلم برداشتہ لکھ ڈالے۔ دل، عبارت آرائی پر آمادہ نہ ہوا۔ اِن خاکوں میں دو چار خاکے ایسے بھی ہیں جو قلم سنبھال کر لکھے گئے ورنہ "اشہبِ قلم کو کوئی امر عناں گیر نہ ہوا"۔

سچ پوچھئے تو ان خاکوں کو صاف کر کے دوبارہ لکھنے کا حوصلہ بھی دل میں نہ پایا۔ ایک دن سارے خاکے Compositer کے حوالے کر دیئے۔ ایک دو کی خود پروف ریڈنگ کی مگر تسلی نہ ہوئی۔ میری رائے ہے کہ مصنف کو خود پروف ریڈنگ نہ کرنا چاہیے چنانچہ جناب ریاض احمد چودھری سے درخواست کی کہ بندہ کی اعانت فرمایئے۔ انہوں نے ہاں کر دی، میرے سر سے بوجھ ہٹ گیا۔ موصوف نے جس مستعدی، محنت اور لگن سے پروف ریڈنگ کی اس کا تہہِ دل سے معترف اور احسان مند ہوں۔ باقی کتاب کا کام یعنی اس کی لے آؤٹ، خاکوں کی ترتیب و تہذیب، اغلاط کی تصحیح، گرد پوش کی زیبائش اور تھوڑا بہت پروف ریڈنگ کا کام میرے چھوٹے بیٹے رضوان معین نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ میری دیرینہ خواہش تھی کہ میری کسی کتاب کا گرد پوش میرے دوست اور کرم فرما جنابِ حنیف رامے کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ الحمد للہ انہوں نے اس کتاب کا گرد پوش تخلیق کر کے میری اس خواہش کو پورا کر دیا۔ میں ان کا ممنون بھی ہوں اور بہ دل سپاس گزار بھی۔ فکر و فن کی دنیا میں آپ کی شخصیت مغتنمات میں سے ہے۔

جب یہ کتاب قریب قریب طباعت کے لئے تیار ہوگئی تو اچانک میرے ذہن میں پھر سے خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ دوسری بار کتاب کی پروف ریڈنگ کرالی جائے، چنانچہ میں نے محترم راجا رشید محمود سے کہ میرے دیرینہ دوست اور کرم فرما ہیں رابطہ قائم کیا اور ان سے اعانت چاہی۔ آپ نے آنکھوں کی بیماری کے

باوجود نہ صرف میری درخواست بخوشی قبول کر لی بلکہ تقاضا کیا کہ اِسے جلد از جلد ان کے حوالے کردوں۔ میں اس سلسلے میں آپ کا بھی تہِ دل سے مشکور ہوں۔

یہاں ایک اور بات عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ کہ خاکوں میں جہاں جہاں حوالوں کی ضرورت محسوس ہوئی اُنہیں بعد میں شامل کر لیا گیا۔ ان حوالوں کی ضرورت زیادہ تر "دیگر کوائفِ زندگی" کے عنوان سے لکھی گئی تحریروں میں پیش آئی۔ اس ہچمچ ان نے خاکوں میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے وقت دو امور کا بطورِ خاص خیال رکھا۔ ایک یہ کہ اس مبداء رحم و کرم کی صفتِ ستار العیوبی کے آئنہ میں بشری کمزوریوں سے اجتناب برتا جائے اور دوسرے نبی پاک ؐ کی اس حدیث پر کہ "اموات کا ذکر بہتر طریق پر کرو" عمل کیا جائے۔

خوانندگانِ کرام! اِن خاکوں میں آپ کو صرف ایک خاکہ ایسا ملے گا جس میں شیرینی کے ساتھ ہلکی سی تُرشی بھی شامل ہے مگر خاکے کا مجموعی تاثر شکر ریز ہی ہے۔ سارے خاکے حقائق پر مبنی ہیں۔ میں نے ہر فنکار کی شخصیت کو بروئے کار لاتے وقت کوشش کی ہے کہ حتی المقدور مبالغہ سے دامن بچائے رکھوں مگر غلطی کرنا لازمہ بشریت ہے۔ نہیں کہہ سکتا کہاں چُوک ہوگئی۔

آپ ان خاکوں میں معدودے چند خاکے ایسے بھی دیکھیں گے جن کا شمول اپنے قبیل کے لحاظ سے اِن میں نہ ہونا چاہیے تھا۔ جیسے قائداعظم، غازی علم دین شہید، یوسف سدیدی، شیخ مبارک علی، افتخار الدین وغیرہ وغیرہ۔ یہ میری مجبوری تھی۔ اگر یہ خاکے اس کتاب میں شامل نہ کرتا تو یہ ننھا سا سرمایہ کتابی صورت میں نہ آنے کے باعث آئندہ منصۂ شہود پر نہ آتا۔ ان خاکوں کے علاوہ مزید پانچ خاکے اس کتاب میں شامل کیے گئے۔ کتاب کی تکمیل سے پہلے ان میں سے تین ہستیاں تو یکے بعد دیگرے دنیا سے کوچ کر گئیں جنہیں اس کتاب میں شامل کرنا میرے لئے ازحد ضروری تھا۔ "شیخ عبدالشکور" کے بارے میں ڈاکٹر ناظر حسن زیدی تاکید کر گئے تھے جس کی تعمیل مجھ پر واجب تھی۔ ادھر "حکیم نبی خان جمال سویدا" کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھتا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ہر ادیب و شاعر کا خاکہ تحریر کرنے کے بعد اس کی نظم و نثر کا نمونہ بھی اس کتاب میں شامل کردوں۔ چند

شخصیات کی تحریرات کے نمونوں کا حصول ممکن نہ ہوسکا تاہم بیشتر مصنفین کے تحریری نمونے کتاب کی زینت بن گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ایک تذکرے کی حیثیت بھی اختیار کر گئی ہے۔

قارئین حضرات!

آخر میں اپنی کوتاہیوں اور ادبی لغزشوں کا بہ دل اعتراف کرتے ہوئے آپ سے التماس گزار ہوں کہ آقائے نامدارؐ کی اس حدیث کے پیش نظر کہ "دار و گیر سے عفو بہتر ہے" آپ میری خطاؤں سے درگزر فرمائیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

بے ہنر

حزیں کاشمیری

انتساب اوّل

یہ 26 مئی 1989ء کا واقعہ ہے، میرا بیٹا ڈاکٹر نعمان معین (رجسٹرار لیڈی ولنگڈن ہسپتال) نمازِ جمعہ ادا کر کے اور ہم سب اہلِ خانہ کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اپنے قریبی عزیز و اقارب کے ہمراہ "نہر میاں میر" پر پکنک منانے گیا۔ نہ جانے کس ترنگ میں خلافِ معمول نہر میں نہانے پر تیار ہوا۔ مجھے آج بھی اس پر تعجب ہے مگر تقدیر کا لکھا اٹل ہے۔ بدقسمتی سے ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب نہر کے تیز بہاؤ اور گہرے پانی میں اترتے ہی آناً فاناً نظروں سے غائب ہوگیا۔ افسوس! ساتھیوں کی تمام تر کوششیں اُسے موت کی دست برد سے نہ بچا سکیں۔ اس حادثہ عظیم سے میرے قلب و روح پر قیامت ٹوٹ پڑی اور زبان مسلسل انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرنے لگ گئی۔ اس صدمے کی اولین ضرب کے بعد کچھ وقت گزرنے پر، ذہنی کیفیت میں قدرے کمی ہوئی تو پژمردہ خاطری اُس قادرِ مطلق کی رضا پر سرِ تسلیم خم کر کے صبر کی راہ پر چل پڑی کہ یہی دینِ قیّم کی تعلیم و ہدایت ہے۔ یہ ہماری کس قدر خوش بختی ہے کہ ہمیں اِس دنیا میں دینِ ابراہیمی کے ناتے سرورِ کونین ؐ، رحمتِ عالم ؐ، شافعِ محشر ؐ کی بدولت مسلمان ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ایک کلمہ گو مسلمان ہونے کی بنا پر مجھے اِس جانکاہ صدمہ پر کیا کرنا چاہیے تھا؟ یہ بات مجھ پر بالکل واضح تھی۔ چنانچہ میں نے اپنے خالق کی مرضی اور اس کے حکم کو اپنے ایمان سے وابستہ کر کے صبر کا دامن تھام لیا۔ خدا مجھے اِس کی توفیق سے بہرہ ور کرے۔ آمین!

میرا بیٹا نعمان معین میری نرینہ صُلبی اولاد میں سب سے بڑا تھا۔ عین عالم جوانی میں ایسے ہونہار، سعادت مند، زکی اور فہیم کا دنیا سے اچانک کوچ کر جانا ایک کن رسیدہ باپ کے لئے جس صدمہ کا باعث بنتا ہے وہ بیان کی احتیاج سے باہر ہے۔ اس رشتے سے بالاتر ہو کر جب میں اس کے افعال و کردار کے آئینہ میں اُس کی ذات کا تعین کرتا ہوں تو ایسی عظیم المرتبت شخصیت کے دنیا سے اِس قدر جلد اُٹھ جانے پر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ وہ ایک نیک دل، نیک سیرت، حیادار، مروت

پیشہ، حلیم، بُردبار، غیرت مند اور "واذا مروا بالغو مروا کراما" کی جیتی جاگتی تفسیر، اپنے فن کا ماہر ڈاکٹر اور سب سے بڑھ کر اپنے پیشے میں انسان کا روگ پالنے والا، غرض و آز سے بالا ایک منکسرالمزاج انسان تھا۔ اس کے ظاہر و باطن میں ایسی یکسانیت تھی جو میں نے فی زمانہ بہت کم دیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں خود اُس کی حیات میں اُس کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ کرنے سے قاصر رہا۔ اس کی موت پر سیکڑوں نہیں ہزاروں آنکھیں اشک بار ہوئیں بالخصوص کوٹ عبدالمالک میں، جہاں وہ پیپلز کلینک کے نام سے اپنا ذاتی مطب چلاتا تھا، کوئی زبان ایسی نہ تھی جو اس کی انسان دوستی، غریب پروری اور خواجگی کے اظہار میں رطب اللسان نہ تھی۔[1] اُدھر لیڈی ولنگڈن ہسپتال میں اُس کے سب رفقاء کار، بلاامتیاز منصب و عہدہ، گہرے رنج و غم کے ساتھ ساتھ اس کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ کئے بغیر نہ رہتے تھے۔[2] میں اپنے اس درویش صفت بیٹے کے بارے میں لاتعداد خطوط اور ان گنت آرا میں سے صرف چند کا حوالہ دے کر یہ کتاب اُس کی روح سے منسوب کرتا ہوں کہ میرے لئے اِس میں حصولِ صبر کی ایک راہ نکلتی ہے۔ خدا کرے میرا یہ بیٹا، جس نے شہادت کا رتبہ حاصل کیا ہے، اُس ارحم الرحمین کی طرف سے بہ طریقِ اصطفیٰ عقبیٰ میں مقامِ بلند پر فائز ہو۔ آمین۔

سوگوار

حزیں کاشمیری

---

[1] اذا جاء اجلھم لا یعا خرون ساعتہ ولا یستقدمون

[2] دُنیا سے رُخصت ہوتے وقت اللہ پاک نے اسے دو فضیلتوں سے سرفراز کیا۔ ایک جمعۃ المبارک کی فضیلت اور دوسرے شہادت کا رُتبہ۔

جمعۃ المبارک کے بارے میں ارشاد ہے

مان مسلم ان یموت فی یوم الجمعتہ اولیلتہ الجمعتہ الا وقہ اللہ من النار

[3] (میں نعمان معین کی رسم چہلم پر کوٹ عبدالمالک گیا۔ ختم شریف کے بعد اپنے بیٹوں کے ہمراہ وہاں کے بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک گلی میں جمع چند عورتیں ہماری طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں "وہ نعمان کے والد چلے آرہے ہیں"۔ جب ہم ان کے قریب سے گزرے تو ایک بوڑھی عورت نے کہا: "اب کوئی ماں نعمان معین پیدا نہ کرسکے گی"۔

فہرستِ مطالب

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
-1	قائداعظم	25
-2	آفتاب احمد قرشی	37
-3	اثر لکھنوی (جعفر علی خان)	39
-4	ایوب رومانی	49
-5	اختر شیرانی	64
-6	ابنِ انشاء	73
-7	احمد معراج	85
-8	افتخار الدین	89
-9	اے ایس بخاری (پطرس)	91
-10	پروفیسر احمد سعید	100
-11	بالا شاعر	104
-12	ترنم امرتسری (علامہ غلام محمد)	107
-13	تنہا (محمد یحییٰ)	121
-14	تبسم (صوفی غلام مصطفےٰ)	130
-15	تاک کشمیری	140
-16	تائب (ملک مراتب علی)	154
-17	جوش ملیح آبادی	157
-18	جگر مراد آبادی	174
-19	حسرت موہانی (مولانا)	183
-20	حسرت (چراغ حسن)	194
-21	حامد علی خان (مولانا)	207

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
-22	حبیب اشعر دہلوی (حکیم)	223
-23	حیرت وارثی	231
-24	حسن دین (ایڈووکیٹ)	241
-25	دامن (استاد)	247
-26	رسول خاں (مولانا)	261
-27	رسا جالندھری (کبیر خاں)	263
-28	زیبا ناروی	273
-29	زکی رضا نقوی (سید)	281
-30	سالک (مولانا عبدالمجید)	286
-31	شورش کاشمیری (آغا)	298
-32	شاد امرتسری	308
-33	شمس الدین (میاں)	315
-34	صلاح الدین احمد (مولانا)	345
-35	طاہر (آغا)	342
-36	ظفر علی خان (مولانا)	345
-37	ظفر (سراج الدین)	362
-38	ظہیر الدین احمد	370
-39	عبدالحکیم (ڈاکٹر خلیفہ)	375
-40	عبدالرحمان امرتسری	412
-41	عدم (عبدالحمید)	416
-42	عابد علی عابد	421
-43	عشرت رحمانی	439
-44	غازی علم الدین شہید	447

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
-45	غلام محمد بٹ امرتسری	452
-46	قمر میرٹھی (ڈاکٹر)	461
-47	کیفی (برجموہن دتاتریہ)	472
-48	کلیم (علاء الدین)	481
-49	محمد حسین (چودھری)	502
-50	میر ولی اللہ ایبٹ آبادی	521
-51	مائل نقوی	530
-52	محمد اکرم صدیقی	535
-53	رمترا (پروفیسر)	559
-54	منٹو (سعادت حسن)	561
-55	محمد باقر (آغا)	574
-56	مہر (مولانا غلام رسول)	577
-57	محمد طفیل (مدیر نقوش)	597
-58	محمد سعید (حکیم)	608
-59	محمود احمد (شیخ)	614
-60	مبارک علی (تاجر کتب)	619
-61	نشتر جالندھری (ابو نعیم عبدالحکیم)	631
-62	نسیم امروہوی	682
-63	ناظم سیوہاروی (مولانا)	693
-64	نظر (قیوم)	697
-65	نامی (پیر غلام دستگیر)	713
-66	نفیس خلیلی	719
-67	نیرّ واسطی	722

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
-68	نیّر سہروردی	733
-69	نسیم محمود	743
-70	وقار عظیم (سیّد)	757
-71	واصف علی واصف	764
-72	ہمدم (استاد)	789
-73	ہادی مچھلی شہری	798
-74	یار جنگ (نواب بہادر)	808
-75	یوسف سدیدی	814
-76	ناظر حسن زیدی (ڈاکٹر)	818
-77	عبدالصمد صارم (مولانا)	858
-78	جیلانی کامران	869
-79	شیخ عبدالشکور	875
-80	احمد نبی خاں سویدا (حکیم)	900

-81 شان الحق حقی 945

حزیں کاشمیری

۱۹ فروری ۱۹۲۸ء کو لاہور میں پیدا ہوئے پرائمری سکول کی تعلیم کے بعد اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ گیٹ سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک پاس کیا۔ دو برس اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے اور ۱۹۴۷ء میں ایف اے کرنے کے بعد لاہور کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی کے ہاں قریب قریب تین برس بطورِ شاگرد کام کیا۔ شیخ مبارک علی کی دکان ان کے لئے ایک درسگاہ ثابت ہوئی۔ وہاں انہیں مولانا رسول خاں، مولانا اصغر علی روحی، مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک، (خان بہادر) چوہدری محمد حسین، پروفیسر متراٗ مرزا ہادی علی بیگ، میر ولی اللہ ایبٹ آبادی، شیخ حسن دین ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایسے علماء و ادبا کی صحبت نصیب ہوئی۔ ۱۹۴۸ء کے آخر میں انہوں نے مکتبہ معین الادب قائم کر کے اشاعتِ کتب کا آغاز کیا۔ دکان کا افتتاح (خان بہادر) چوہدری محمد حسین کے ہاتھوں ہوا۔ ایک طرف ادبِ عالیہ کی اشاعت اور دوسری طرف خود نظم و نثر کی متعدد کتب تصنیف و تالیف کر کے خدمتِ ادب کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ نظم میں اب تک ان کی سات تصانیف ''محبت''۔ ''ناز و نیاز''۔ ''سلکِ لآلی''۔ ''موج موج ساحل''۔

''لمعاتِ نور''۔ ''سخن در سخن''۔ اور ''گوتم بدھ'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔ تین مجموعے ''حدیثِ دیگراں''۔ ''ایک آواز'' اور ''صریرِ خامہ'' زیرِ طبع ہیں۔ نثر میں بھی متعدد کتب تحریر کر چکے ہیں۔ بالخصوص علامہ اقبال کے اُردو کلام کی تشریحات کا کام مکمل کر چکے ہیں۔ اشاعتِ کتب اور اپنی تصانیفی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے ۱۹۶۵ء میں اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے اردو کیا۔ موسیقی سے مناسبتِ طبعی رکھتے ہیں اور اس کے رموز سے آشنا ہیں۔ صوفی منش ہونے کے ناتے حضرت مولانا غلام ربانی نقشبندی مجددی مرحوم سے بیعت ہوئے اور سالکِ کامل و شیخِ اکمل حضرت غلام رضا علوی اویسی مقیم راولپنڈی سے عقیدت اور نیاز مندی کا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔

تصنیفاتِ حزیں کاشمیری

مطبوعہ کتب

۱۔ محبت (نظم)

۲۔ ناز و نیاز (غزل)

۳۔ سلکِ لآلی مع گنجینۂ معرفت (نظم) متعلقہ معتقدات مع ملفوظات

۴۔ موج موج ساحل (غزل)

۵۔ لمعاتِ نور (نعتیہ رُباعیات)

۶۔ سخن در سخن (نظم)

۷۔ گوتم بُدھ (نظم)

۸۔ کہاں گئے وہ لوگ (نثر۔خاکے)

زیرِ طبع کتب

۹۔ مقالات (تنقیدی مضامین)

۱۰۔ ایک آواز (نظم)

۱۱۔ حدیثِ دیگراں (غزل)

۱۲۔ تشریحاتِ بانگ درا

۱۳۔ تشریحاتِ بالِ جبریل

۱۴۔ تشریحاتِ ضربِ کلیم

۱۵۔ سفرنامہ مارکوپولو (ترجمہ)

۱۶۔ بہادر عورتیں (ترجمہ)

۱۷۔ مارٹن لوتھر (ترجمہ)

05 - 02 - 1950

13 - 07 - 1958

حزیں کاشمیری

05 - 06 - 1985

13 - 05 - 2005

قائداعظم محمد علی جناح

قائداعظم پر کچھ تحریر کرنے سے قبل میں پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بارے میں چند ضروری باتوں کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ حصولِ آزادیِ پاکستان کے زمانے میں کسی بھی غلام ملک (کالونی) کا آزادی حاصل کرنا اس بات پر منحصر تھا کہ آیا اُس کا تشخص ایک قوم کی حیثیت رکھتا ہے یا نہیں۔ اُن دنوں اہل مغرب "نظریۂ قومیت" کو اساسی حیثیت دے کر شدومد سے اس کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک "مذہب" حصولِ آزادی کی اساس نہ بن سکتا تھا۔ قائداعظمؒ اہلِ مغرب کے اس نظریے سے بخوبی واقف تھے اور انہیں اس کا پوری طرح احساس تھا کہ یہ حضرات اپنے اس نظریے سے ذرہ برابر بھی پیچھے نہ ہٹیں گے لہٰذا اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ انہی کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کے آئنہ میں پاکستان کا حصول ممکن بنائیں گے۔ انہوں نے کھلے الفاظ میں انگریزوں کے سامنے اپنا موقف ایک الگ قوم کی حیثیت سے پیش کر دیا اور ایسے ایسے دلائل فراہم کیے جس سے برصغیر کے مسلمانوں کی بحیثیت "قوم" الگ پہچان ہونے لگی اور بالآخر

انگریزوں نے بھی مسلمانوں کو ایک الگ قوم تسلیم کر لیا۔ قائداعظم نے پاکستان کے "مقدمے" کی بہ کمال تدبر، انتہائی دانش، انتہائی جرأت اور انتہائی مستعدی سے پیروی کی اور اہلِ مغرب کے بنائے ہوئے قومیت کے ہتھیار کو اُنہی پر استعمال کر کے میدان مار لیا۔ قائداعظم مرحوم اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں فی الحقیقت جو فرق ہے وہ کفر و اسلام ہی کا ہے اور یہ فرق ان سے علیحدہ ہونے کی ایک ایسی معقول اور ٹھوس حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا مگر انہوں نے درپیش حالات کے آئنہ میں اسے بنیادی مسئلہ بنانے سے گریز کیا۔ چنانچہ اُدھر وہ پاکستان کا مقدمہ لڑتے رہے۔ اِدھر ان کے پیروکار اس نعرہ پر عمل کرتے رہے: پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ

سچ پوچھیے تو حقیقت بھی یہی تھی جس کی بنا پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ دوسرا بڑا اہم کام جو قائداعظم مرحوم نے کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے انگریزوں کے سامنے یہ دعویٰ کر دیا کہ ان کی جماعت "مسلم لیگ" ہی وہ جماعت ہے جو بحیثیتِ مجموعی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ انہوں نے کہا ہندوؤں کی جماعت "کانگرس" کا یہ دعویٰ، کہ اُن کی جماعت جہاں ہندوؤں کی نمائندہ ہے وہاں مسلمانوں کی بھی ہے، قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کانگرس میں بھی مسلمان عوام کا ایک گروہ اور بڑے بڑے لیڈر شامل تھے مگر قائداعظم" کو یقین تھا کہ بہ فضلِ خدا ان کا کہا ہوا سچ ثابت ہوگا۔ چنانچہ 1946ء میں، جب الیکشن کے نتائج سامنے آئے، تو مسلم لیگ حیران کن ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہوئی اور اس نے ثابت کر دیا کانگرس نہیں مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کامیابی پر کہنے والوں نے کہا اور سچ کہا: "آج پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کا فیصلہ ہوگیا۔" پھر تھوڑی ہی مدت بعد سب نے دیکھ لیا کہ دنیا کے نقشے پر پاکستان اُبھر آیا۔

خواندگانِ کرام! یہ بات میرے لیے باعثِ فخر ہے کہ 1940ء میں جب "منٹو پارک" حال "مینارِ پاکستان" میں قرار دادِ پاکستان پیش کی جا رہی تھی تو اس

میں یہ ناچیز بھی شامل تھا۔ شامیانوں اور قناتوں سے ایک بڑا پنڈال بنایا گیا تھا جس کے اندر سٹیج سجائی گئی تھی۔ اس پر چند کرسیوں کے علاوہ ایک چار پانچ فٹ کا اونچا ڈیسک تھا جس کے سامنے لاؤڈ سپیکر رکھا تھا۔ پنڈال سے باہر میزیں رکھی گئی تھیں جن پر مسلم لیگ اور پاکستان کے بارے میں لٹریچر رکھا ہوا تھا۔ میری عمر اس وقت بارہ برس کی تھی اور میں سیاست سے تھوڑا بہت آگاہ تھا۔ پنڈال میں اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ مقررّ حضرات یکے بعد دیگرے سٹیج پر آ آ کر بڑی جوشیلی تقریریں کر رہے تھے۔ ان سارے مقرر حضرات میں مجھے مولانا محمد بخش مسلم کی تقریر کے چند الفاظ یاد رہ گئے جو قائداعظم" کی سیاسی فراست اور پاکستان کی اہمیت کے بارے میں تھے۔ مولانا مرحوم اپنی تقریر میں نہایت ولولہ انگیز الفاظ استعمال کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں انگریزی کی Quotations بھی دیتے جا رہے تھے۔ سارا پنڈال تالیوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔

جب قرار دادِ پاکستان منظور کر لی گئی اور میں اپنے تایا زاد بھائیوں اور والد مرحوم کے ہمراہ گھر کو روانہ ہوا تو جگہ جگہ مسلمان آبادی میں لوگوں کو قائداعظم" اور پاکستان کے بارے میں بڑے خوشگوار انداز میں باتیں کرتے دیکھا اور سنا۔

خواندگانِ کرام! اب میں پھر پیچھے لوٹتا ہوں یعنی آزادی سے کچھ عرصہ پہلے کے واقعات کی طرف۔ ہندوؤں کی پاکستان سے نفرت کی بنا پر ان کے دلوں میں مسلمانوں کے لیے جو کشیدگی پائی جاتی تھی اس میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ہندوؤں نے جگہ جگہ ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیے تھے۔ مسلمان بھی اس سے بے خبر نہ تھے مگر اس بات سے قطعاً لاعلم تھے کہ یہ کشیدگی بڑھتے بڑھتے بھیانک روپ اختیار کرے گی۔ پاکستان بننے سے کچھ ہی عرصہ قبل ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے اور قتل و غارت کی وارداتیں شدت اختیار کر گئیں۔ مذہب نے نفرت کا روپ دھار کر انسانیت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں تک کو اس آگ میں دھکیل دیا گیا۔ ایسے ایسے روح فرسا منظر خصوصاً (سانحہ چوک پراگ داس، امرتسر) دیکھنے میں آئے کہ الامان و الحفیظ۔

"ریڈ کلف ایوارڈ" سے تین چار روز قبل لاہور کے حوالے سے بات کرتا

ہوں کہ لوگوں پر عجب خوف و ہراس طاری تھا۔ جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہا تھا امرتسر پاکستان کے حصے میں آئے گا، کوئی اس کی نفی کر رہا تھا۔ انارکلی کے ایک ریستوران کے مالک لوگوں سے شرطیں لگا رہے تھے کہ "لاہور بھارت کے حوالے کر دیا جائے گا۔" میں اپنی جگہ پر بہت مطمئن تھا کہ میں اس ٹیم میں شامل تھا جس نے دن کے چوبیس گھنٹوں میں بیس بائیس گھنٹے کام کر کے نقشوں کی مدد سے اور اکثریتی مسلمان آبادی کو سامنے رکھ کر فہرستیں تیار کی تھیں۔ ان فہرستوں میں نہ صرف امرتسر بلکہ اس کے گرد و پیش کے بہت سے علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی مگر جب "ریڈ کلف ایوارڈ" کا اعلان کیا گیا تو نہ صرف مغربی پاکستان کے مسلمان علاقے ہندوؤں کے حوالے کر دیے گئے بلکہ یہی کچھ مشرقی پاکستان میں بھی کیا گیا۔ اس فیصلے پر پاکستان کا ہر شہری ہکا بکا رہ گیا مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ "ریڈ کلف" کے اس غیر منصفانہ ایوارڈ کے بعد جب قائداعظمؒ نے ریڈیو پاکستان سے قوم کو اعتماد میں لیتے ہوئے اس پر اظہارِ خیال کیا تو نہایت جذباتی انداز میں ارشاد فرمایا: "ہم اسے ایک غیور قوم ہونے کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں۔"

قارئین کرام! میں یہاں ایک اور بات تحریر کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ سند رہے۔

جن دنوں پاکستان بنا، میں ان دنوں شیخ مبارک علی تاجر کتب کی دکان پر ان کے شاگرد کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یہ دکان اندرون لوہاری دروازہ واقع تھی جو چاروں طرف سے ہندوؤں کی آبادی میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں سے ایک راستہ لوہاری منڈی سے ہوتا ہوا سوہا بازار کو جاتا تھا۔ دونوں راستوں پر واقع مکانات ہندوؤں کی آبادی سے بھرے ہوئے تھے۔ میں ان خوفناک دنوں میں بھی روزانہ دکان کھولتا رہا کہ یہی استاد کا حکم تھا۔ ایک روز میں لوہاری دروازے سے اندر داخل ہو کر دکان کی جانب چلا جا رہا تھا کہ بائیں جانب موڑ سے چند قدم پہلے تین چار نوجوانوں کو دیکھا جو ہاتھوں میں بڑے بڑے برہنہ خنجر لیے کسی ہندو کو قتل کرنے کی غرض سے چلے آ رہے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے پیچھے ایک سفید ریش

بزرگ بھی چلے آ رہے ہیں۔ وہ دفعتاً دو چار تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے ان کے سامنے آ موجود ہوئے اور نوجوانوں سے کہنے لگے:

"میرے بیٹو! میرے بچو! ان خنجروں کو اب نیام کر لو۔ اب پاکستان بن گیا ہے۔ اب ہمیں کسی سے کچھ نہیں لینا۔"

خدا گواہ! اس فرشتہ صفت بزرگ ہستی نے یہ الفاظ ایسی منت و سماجت اور ایسی رقت آمیز آواز میں کہے کہ وہ سب کے سب واپس چلے گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان نوجوانوں کا واپس چلے جانا گویا پوری قوم کا واپس چلے جانا تھا۔ حصولِ پاکستان کے بعد ہر فرد و بشر کا یہی نظریہ تھا مگر افسوس دوسری طرف سے شر انگیزی اور فتنہ و فساد کی آگ بجائے مدھم ہونے کے، بھڑکتی ہوئی نارِ جہنم کو شرمندہ کرنے لگی۔ چنانچہ پاکستان کی تخلیق سے کچھ ہی دنوں بعد بھارت نے نہتے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ خون سے لت پت ہزاروں لاشیں ریل گاڑیوں کے ذریعے پاکستان آنا شروع ہو گئیں۔ ہزاروں لٹے پٹے قافلے سرزمینِ پاکستان پر اترتے چلے گئے۔ اپنے حفاظتی اسلحہ کے ساتھ آنے والے خاندان بھی صحیح و سلامت پاکستان نہ پہنچ سکے۔ عورتوں کی بے حرمتی کے ایسے ایسے دل خراش واقعات سامنے آئے جن کو ورطہ تحریر میں لاتے ہوئے صفحۂ قرطاس کا سینہ شق ہو جائے گا۔ اس قتل و غارت سے ہندوؤں کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں کی نئی مملکت کو معاشی بحران میں مبتلا کر کے نیست و نابود کر دیا جائے، چنانچہ ان لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آئے ہوئے مہاجرین نے ایسی ہی صورت حال پیدا کر دی۔ اس آفت زدہ فضا اور ناگفتہ بہ حالات میں قائدِ ملت خان لیاقت علی خانؒ قائداعظمؒ کے پاس پہنچے اور انہیں تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہنے لگے:

"جناب قائداعظم! پاکستان کا ہر محکمہ بھیانک منظر پیش کر رہا ہے۔ ہمارے دفتروں میں اگر قلم ہے تو دوات نہیں، اگر دوات ہے تو قلم نہیں۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم شکست تسلیم کر لیں۔"

قائداعظم اس پر متفکر ہوئے اور چند لمحے اِدھر اُدھر ٹہل کر گرج دار آواز

میں بولے: "No Surrender."

قائد ملت کا ارشاد ہے کہ قائداعظمؒ کے ان الفاظ نے میرے قلب و نظر کی ہیئت بدل کر رکھ دی۔ پھر ہم سب نئے جوش و جذبے کے ساتھ پاکستان کی تعمیرِ نو میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

راقم الحروف نے قائداعظم کی چار پانچ سے کم تقریریں نہ سنی ہوں گی جن میں سے صرف دو تقاریر کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک بار میں نے انہیں بادشاہی مسجد میں تین چار فٹ کے فاصلے سے بھی دیکھا تھا۔ آپ وہاں تقریر کرنے تشریف لائے تھے مگر بہ وجوہ تقریر نہ کرسکے۔ واپس جانے لگے تو ایک جمِ غفیر نے انہیں گھیر لیا۔ لوگ دو رویہ کھڑے، دیوانوں کی طرح، انہیں دیکھنے کے متمنی تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس موقع پر موجود منتظمین اور ان کے کارکنان ہجوم کو مسلسل پیچھے نہ دھکیلتے رہتے تو نہ جانے کیا آفت ٹوٹ پڑتی۔ قائداعظمؒ جلد جلد قدم اٹھاتے مسجد سے باہر نکل گئے۔

اب میں قائداعظمؒ کی ایک تقریر کے بارے میں کچھ عرض کرتا ہوں۔ یہ تقریر اسلامیہ کالج کے ہال میں ہوئی تھی۔ پورا ہال مع اپنے برآمدوں کے حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ قائداعظمؒ براہِ راست طلبہ سے مخاطب تھے اور انہیں حصولِ تعلیم پر مستعد رہنے کی تلقین کر رہے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ پاکستان کی تعمیر کے حوالے سے ان کی پیٹھ بھی ٹھونک رہے تھے۔ مجھے ان کی تقریر کا ایک جملہ یاد رہ گیا جو میں نے اسلامیہ کالج کی صد سالہ تقریب پر اسی ہال میں اُسی جگہ کھڑے ہو کر طلبہ کو اُنہی کے لہجہ کی نقل اتارتے ہوئے سنایا تھا۔ آپ بھی سنیے:

تقریر کرتے کرتے ایک مقام پر کہنے لگے Work، پھر ذرا وقفہ دے کر فرمایا Work، پھر فرمایا and اور ایک لمبا وقفہ دیا جب تمام حاضرین ان کا اگلا لفظ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئے تو نہایت گرج دار آواز میں فرمایا ـــــ Work۔

قائداعظمؒ مرحوم کی دوسری تقریر میں نے اسلامیہ کالج کی گراؤنڈ میں شامیانوں اور قناتوں سے سجائے ہوئے پنڈال میں سنی۔ سٹیج کا اہتمام گراؤنڈ کے قریباً مرکز میں کیا گیا تھا۔ پوری گراؤنڈ سامعین سے بھر گئی تھی۔ قائداعظمؒ ابھی

تشریف نہ لائے تھے۔ لوگوں میں قدرے اضطراب پیدا ہوگیا تھا مگر جلد ہی آپ تشریف لے آئے۔ نعروں کی صدائیں بلند ہوئیں اور چہروں پر رونقیں عود کر آئیں۔ قائداعظم کچھ ہی وقت کرسی پر بیٹھ کر سرو قامت کھڑے ہوئے اور تقریر کرنے لگے مگر سامنے 'مبارک مسجد' سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ قائداعظمؒ نے فوراً کلائی کی گھڑی ملاحظہ کی اور پاس بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا کہ یہ کس نماز کی اذان ہے؟ اس وقت نہ تو یہ اذان ظہر کی ہوسکتی تھی نہ عصر کی۔ سب لوگ حیران تھے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے خاکساروں کی ایک لمبی قطار، جس کی قیادت علامہ عنایت اللہ خان مشرقی کر رہے تھے، چپ راست، چپ راست کہتی اور قدم پر قدم مارتی ہوئی سٹیج کی طرف بڑھنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علامہ مشرقی قائداعظمؒ سے تھوڑے فاصلہ پر ان کے سامنے کھڑے ہوگئے پھر ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: "مسٹر جناح، مجھے بھی سٹیج پر آکر کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔" قائداعظمؒ نے فوراً جواب دیا: "براہ کرم آپ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے اجازت لیجیے، میں تو خود ان کا مہمان ہوں۔" دراصل علامہ مشرقی سٹیج پر قبضہ کرکے قائداعظمؒ کے نظریات کی نفی اور اپنے نظریات کا پرچار کرنا چاہتے تھے۔ وہ قائداعظم کے سخت مخالف تھے۔

قائداعظمؒ کو جب علامہ صاحب کی نیت کا اندازہ ہوا کہ وہ سٹیج پر قبضہ کرکے تقریر کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: "مجھے ان کے تقریر کرنے پر کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ وہ دو آنے کا ٹکٹ لے کر پہلے مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں۔"

اس پر جلسہ گاہ سے ایک زبردست شور برپا ہوا اور "لیگ میں آؤ، لیگ میں آؤ" کی آوازوں سے پورا پنڈال گونجنے لگا۔

جب عوام نے یہ دیکھا کہ علامہ صاحب سٹیج کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں اور ان کے سٹیج پر آجانے سے کوئی طوفان بدتمیزی برپا نہ ہو جائے تو انہوں نے فوراً قائداعظمؒ کو محفوظ مقام پر منتقل کر دیا۔ پھر عوام الناس اور خاکساروں میں دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ علامہ مشرقی کا بُرا حال ہوا۔ ایک منچلے نے اس شامیانے کی رسیاں کاٹ دیں جس کے نیچے علامہ کھڑے تھے۔ یہ شامیانہ ان پر آن گرا۔ پھر یہی

شامیانہ عین درمیان میں سے ایک آدھ فٹ پھاڑ کر ان کے گلے کی زینت بنا دیا گیا۔ اس کے بعد طلبہ نے انہیں گھیرے میں لے کر طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ پھر مجھے معلوم نہ ہوا کہ وہ کس طرح وہاں سے رخصت ہوئے۔

ہاں ایک بات لکھنا بھول ہی گیا قائداعظمؒ مرحوم اس وقت عوام الناس کے اصرار پر اردو میں تقریر کر رہے تھے۔ اللہ اللہ ان کی ٹوٹی پھوٹی اردو پر لوگوں کا اشتیاق، ان کی محبتیں، ان کا پیار دیدنی تھا۔ مجھے ان کی تقریر کے ایک دو جملے یاد رہ گئے۔ فرما رہے تھے:

"لوگ کہتے ہیں مسلم لیگ نوابوں اور جاگیرداروں کی جماعت ہے، میں پوچھتا ہوں آپ میں کتنے لوگ نواب اور جاگیردار ہیں۔"

اب میں جدوجہد حصولِ پاکستان کے حوالے سے اسلامیہ کالج کی سرگرمیوں کا تھوڑا بہت ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

قارئین کرام!

اگر میں یہ کہوں کہ پاکستان بنانے میں اسلامیہ کالج، لاہور کی حیثیت مرکزی تھی تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔ مجھے جان و دل سے تسلیم ہے کہ بڑے بڑے اداروں، بڑی بڑی درسگاہوں، علماء کرام و صوفیائے عظام کی خانقاہوں کی عملی کارگزاریوں کے ساتھ ساتھ برصغیر پاک و ہند کے ایک ایک فرد نے پاکستان بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر اسلامیہ کالج نے ایک نہایت ہی موثر و منظم انداز میں ایسی عظیم کارکردگی کا مظاہرہ کیا جو دوسروں میں کم نظر آیا۔ ان دنوں اسلامیہ کالج میں "سٹوڈنٹس فیڈریشن" کے ناظمِ اعلیٰ جناب قاسم رضوی تھے جو گفتار اور کردار دنوں کے غازی تھے۔ اس وقت ان کی شخصیت اپنے منفرد انداز و اطوار کے لحاظ سے طلبہ میں تحریکِ آزادی کا نقطۂ ماسکہ بن چکی تھی۔ اساتذہ سے لے کر پرنسپل تک ان کے زیرِ اثر آ چکے تھے۔ سچ یہ ہے کہ پورا کالج ان کے زیرِ نگیں تھا۔ آپ کا کام یہ تھا کہ طلبہ کے گروپ تشکیل دے کر، جو عموماً دس دس یا بارہ بارہ کی تعداد میں ہوتے تھے، ایک خاص قسم کی تربیت دے کر پنجاب کے دیہاتوں میں مسلم لیگ

کی تشہیر (پروپیگنڈا) کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ان گروپوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر دن رات کام کیا۔ یہ بندۂ حقیر بھی ایسے ہی ایک گروپ میں شامل تھا۔ میں نے اس کی ایک ہلکی سی جھلک "آفتاب احمد قرشی" کے خاکے میں پیش کر دی ہے۔ اب میں قائداعظمؒ کے بارے میں دو ایک باتیں کہہ کر خاکے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہوں۔

حضراتِ گرامی!

میں نے ٹیلی ویژن پر دو ایک بار دیکھا اور متعدد بار اخباروں میں پڑھا کہ عام لوگ بھی قائداعظمؒ کو مشورہ دیا کرتے تھے۔ ایک بار رکشا ڈرائیور نے بھی ان سے باتیں کی تھیں، ایک دو نے سیاست میں (اگرچہ دبے الفاظ میں) ان کی رہنمائی بھی کی تھی۔ میں جب ایسی باتیں سنتا ہوں تو بخدا حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔ دوستو! اس باب میں قائداعظمؒ کے بارے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ وہ بڑی بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ مشورے کی تو بات رہی الگ، ان سے ملاقات کا وقت لینا بھی ایک کارِ عظیم تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ آپ کسی رعونت اور کبر میں مبتلا تھے بلکہ ان کا وقت اتنا قیمتی تھا جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ ہمہ وقت قومی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ایک بار میرے تایا زاد بڑے بھائی محمد اکبر مرحوم نے انہیں چندہ اکٹھا کر کے ارسال کیا تو فوراً اپنے دستخطوں سے اس کی رسید بھجوائی۔ اس طرح انہوں نے ہزاروں نہیں لاکھوں خطوط، رسیدات اور دستاویزات پر دستخط کیے ہوں گے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام، جس کا قومی کاموں میں عموماً سرے سے کوئی کھاتہ نہیں ہوتا، اس کے مقابلہ میں وہ کام جو انہوں نے انجام دیا کس قدر Time Consuming ہوگا۔ اس طرح قائداعظمؒ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ وہ وقت کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اپنے ملنے والوں کو ان کے مقرر کردہ وقت سے زیادہ وقت نہ دے سکتے تھے اور انہیں کلائی کی گھڑی دکھا کر کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ان کی پوری زندگی گویا ایک کیلنڈر تھی جس پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یوں تو بڑے بڑے قومی لیڈر پیدا ہوئے، ہندوؤں میں بھی اور مسلمانوں میں بھی، مگر

سچ یہ ہے کہ قائداعظمؒ کی ٹکر کا لیڈر آج تک پیدا نہ ہوسکا۔ قائداعظمؒ نے جس طرح قوم کو بیدار کیا، جس طرح ہندوؤں کی مکاریوں سے انہیں آگاہ کیا، جس طرح انہیں سیدھی راہ پر لاکر پاکستان کی منزل پر لے آئے وہ انہی کا کام تھا۔ قوم کا ہر چھوٹا بڑا ان کے ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھا۔ وہ دلوں پر راج کرتے تھے۔ وہ حق گوئی اور بیباکی کے مظہر تھے۔ اُنہوں نے مکاری، جھوٹ، دغابازی اور عیاری کی سیاست نہ کی۔ انہوں نے بہ بانگ دھل کہا تھا:

"میں ہندو کو سچائی سے شکست دوں گا۔"

جب بھارت نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تو آپ نے فرمایا:

"Donot worry, Kashmir is in my pocket."

مگر افسوس قائداعظمؒ کی عمر نے وفا نہ کی۔ سر آغاخان نے اپنی یادداشتوں کی جو کتاب تحریر کی ہے اس میں انہوں نے دنیا کے بڑے بڑے سیاستدانوں سے اپنی ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں چرچل کی شخصیت بھی شامل ہے۔ ان تمام شخصیتوں پر محاکمہ کرنے کے بعد آپ واشگاف الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں: "میں نے قائداعظمؒ کو ان سب سے عظیم پایا۔"

دو تین برس ہوئے ایک نوجوان طالب علم مجھے دُکان پر ملنے آیا۔ قائداعظمؒ پر مقالہ تیار کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے قائداعظمؒ کو کیسا پایا؟ کہنے لگا:

"وہ تو اہل مغرب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ سوٹ پہنتے تھے۔ ٹائی اور بو لگاتے تھے۔ فلٹ ہیٹ سر پر رکھتے تھے۔ سگار پیتے اور کبھی کبھی مناکل کا بھی استعمال کرتے تھے۔ انگریزوں کی طرح وقت کی پابندی کرتے تھے۔ مذہب کا تو انہیں سرے سے پتہ ہی نہ تھا۔"

میں اس کی بات سن کر دم بخود رہ گیا اور سوچنے لگا کیا قائداعظمؒ وہ شخص نہ تھے جن کے آگے حکیم الامت نے نہایت عاجزی اور درد مندی سے مسلسل درخواست کی تھی کہ:

"قائداعظمؒ سارے برصغیر میں آپ ہی وہ واحد شخص ہیں جو مسلمانوں کی قیادت کا کام انجام دے سکتا ہے۔"

میں نے فوراً ہی اس خیال کی گرفت سے آزاد ہو کر اس سے کہا:

"قائداعظم نے اچکن اور شلوار بھی زیب تن کی ہے۔ سر پر دو در کی قراقلی نما ٹوپی بھی پہنی ہے۔ سگار کی جگہ سگرٹ بھی پیا ہے۔ وقت کی پابندی تو مومن پر واجب ہے، یہ انگریزوں کی تقلید نہیں ہے۔ میرے دوست! ان چیزوں سے کسی کی شخصیت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ باقی رہا وہ مذہب سے کس قدر واقف تھے؟ تو اس کے بارے میں ان کا اپنا بیان کردہ یہ واقعہ پڑھ لو۔" میں نے اس کے آگے ایک کتابچہ رکھ دیا۔

"میں لندن میں اپنے فلیٹ میں سو رہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر کسی نے میرے بستر کو ہلایا۔ میں نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ میں سو گیا۔ میرے بستر کو پھر جنبش ہوئی۔ میں پھر اُٹھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔ خیال کیا "شاید بھونچال آیا ہوگا۔" کمرے سے باہر نکل کر دوسرے فلیٹوں کا جائزہ لیا تو تمام لوگ سو رہے تھے۔ میں واپس آکر پھر بستر پر سو گیا مگر تیسری بار نہایت زور سے میرے بستر کو حرکت دی گئی۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ پورا کمرہ خوشبو سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ کوئی غیر معمولی شخصیت میرے کمرے میں موجود ہے۔

میں نے کہا: Who are you?

جواب آیا "I am your prophet Muhammad ﷺ."

میرے منہ سے فوراً یہ الفاظ نکلے:

"Peace be upon you," my Lord.

پھر مجھے ایک خوبصورت آواز میں کہا گیا:

Mr. Jinnah! you are urgently required by the

muslims of the Sub-continent and order you to lead the freedom movement. I am with you. Don't worry at all. You will succeed in your mission In-Sha-Allah.

O.K. my Lord. اس پر میں نے عرض کیا

زیبا ناروی

یہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے کچھ عرصہ ادھر کی بات ہے۔ میرے ایک دوست تھے صدیقی صاحب' اچھے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ ادب کا ذوق رکھتے تھے۔ خصوصاً انگریزی ادب کی طرف زیادہ راغب تھے۔ ان کی بیوی بھی ایک پڑھی لکھی' زیرک اور سلیقہ مند خاتون تھیں۔ دونوں میں ذہنی یگانگت کمال درجہ کی تھی اور وہ دوسروں کی نظر میں قابلِ رشک زندگی بسر کر رہے تھے مگر فلکِ کج رفتار کو ان کی یہ ادا پسند نہ آئی اور چند معمولی باتوں پر اُن میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ چونکہ دونوں اپنی قابلیت کی بنا پر ایک دوسرے پر فوقیت رکھنے کے زعم میں مبتلا تھے' لہٰذا معاملہ سلجھنے کے بجائے الجھتا گیا اور دونوں اسے انا کا مسئلہ بنا بیٹھے۔ صدیقی صاحب کو جب عالم پریشانی میں کوئی راہ سجھائی نہ دی تو انہوں نے سوچا کہ شعر کو پردہ بنا کر دل کے احساسات ان تک پہنچا دیے جائیں اور اس طرح دونوں کے دلوں سے کدورت رفع ہو جائے گی۔ چنانچہ وفورِ جذبات سے مجبور ہوکر انہوں نے ڈیڑھ سو' دو سو اشعار کی ایک مثنوی کہہ ڈالی جس میں اپنے دل کا احوال بیان کیا اور شعر کے پردہ میں اپنی

غلطیوں کا اعتراف بھی کیا۔ پھر التجاؤں میں ڈوبی ہوئی معذرت پیش کر کے ان سے اپنی جانب رجوع ہونے کی' درخواست کی۔ جب یہ مثنوی پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو پھر انہیں کسی استادِ فن کی تلاش ہوئی کہ وہ اس کی اغلاط درست کر کے ایک خوبصورت اور قابلِ قبول مثنوی کے روپ میں ڈھال دے۔ یہ صاحب' مثنوی کا مسودہ لے کر' سب سے پہلے میرے پاس آئے اور اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ میں نے حالات کا جائزہ لے کر مناسب نہ سمجھا کہ انہیں' اس مثنوی کی اصلاح کے سلسلہ میں' اپنے استاد جناب نشتر جالندھری کے ہاں لے جاؤں۔ بعد ازاں ادھر اُدھر نظر دوڑائی تو زیبا ناروی ہی ایک ایسی شخصیت دکھائی دیے جو اس کام کے لیے موزوں تھے۔ لیکن ان دنوں' میں سوا ان کے نام کے' اور خود ان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھنے کے' ان سے قطعاً ناآشنا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر میں نے انکار کر دیا۔ مگر صدیقی صاحب کہنے لگے کہ زیبا ناروی کا ڈھونڈا میرا کام مگر آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ بھی میرے ہمراہ ان سے ملنے چلیں گے۔ میں نے کہا۔ اس میں کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ ایک روز بعد وہ مجھے سکوٹر پر بٹھا کر' زیبا صاحب کے گھر لے گئے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ زیبا صاحب ان دنوں کہاں رہتے تھے' مگر یہ مکان وہ مکان نہ تھا جو کرشن نگر میں واقع تھا اور جہاں وہ آخر دم تک سکونت اختیار کئے رہے۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں ایک تنگ سی سیڑھیوں سے' جو بازار سے شروع ہوتی تھیں' سیدھا چڑھ کر پہلی منزل پر آموجود ہوئے' کمرہ قدرے چھوٹا تھا۔ سردیوں کے دن تھے' آپ اس وقت چارپائی پر بیٹھے کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ ہم سلام عرض کر کے ان کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ان کے لیے اجنبی تھے۔ تاہم میں نے پہل کر کے اپنا تعارف کرایا اور استاذی نشتر جالندھری کا ذکر کیا۔ آپ فوراً میری طرف متوجہ ہوئے' فرمایا کیا کام ہے..... اس پر میں نے من وعن صدیقی صاحب کا سارا واقعہ بیان کر دیا۔ کہنے لگے' جی ہاں! ایک نظر ضرور دیکھ لوں گا مگر آج کل کم فرصت ہوں' آپ حضرات اسی دن' اسی وقت تشریف لائیے اور اپنی اصلاح شدہ مثنوی لے جائیے۔ ہم حسبِ وعدہ مقررہ دن پھر زیبا کے ہاں جا پہنچے۔ آپ نے ہمیں دیکھتے ہی تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی وہ مثنوی نکالی اور ہمارے سپرد کر دی۔ زیبا مرحوم سے یہ میری پہلی دو ملاقاتیں' جو نہایت مختصر سی

تھیں' ہوئیں۔ زیبا مرحوم مجھے اپنے اطوار اور اندازِ گفتگو سے خوش خلق دکھائی دیئے' وسیع القلب نظر آئے۔ مہمان نواز بھی معلوم ہوئے اور شستگی و شائستگی کے باوصف رکھ رکھاؤ کے آدمی بھی نظر آئے۔

اس ملاقات کے بعد جب میں کئی دن گزرنے پر' صدیقی صاحب سے ملا اور ان کی مثنوی پر' ان کی اصلاحوں کا ذکر کیا' تو کہنے لگے۔ یہ اصلاحیں مجھے پسند نہیں۔ میں جس طرح کے اشعار چاہتا تھا ویسے زیبا صاحب کی اصلاح سے بن نہ پڑے۔ پھر وہ مجھے اپنے ہمراہ لے کر بادی مچھلی شہری کے ہاں جا پہنچے مگر یہاں بھی ان کی مطلب برآری نہ ہو سکی۔ دراصل صدیقی صاحب جیسا چاہتے تھے ویسا کسی بھی استاد سے ممکن نہ تھا۔ خیر۔ زیبا ناروی سے ان ملاقاتوں کے بعد سالہا سال تک ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا مگر جب میں نے استاذی نشتر کے کہنے پر ''مخلصینِ ادب'' کے مشاعروں میں شرکت کرنا شروع کر دی تو وہاں ان سے روابط پیدا ہو گئے۔ پھر یہ روابط' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ' خاصے مستحکم ہو گئے۔ میں نے کم و بیش پندرہ برس ان کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ جس طرح میرے استاد نشتر جالندھری' کبیر خاں رسا جالندھری' منظور عثمانی' عمر کے لحاظ سے مجھ سے بہت بڑے تھے اسی طرح زیبا ناروی بھی بزرگی میں میرے باپ کے برابر تھے' مگر سچ کہتا ہوں کہ یہ بزرگی خصوصاً مشاعروں کی مجلسوں میں کبھی ایک دوسرے کے آڑے نہ آئی۔ البتہ عمر کے لحاظ سے ان کا احترام میرے دل میں ہمیشہ قائم رہا۔ میں' ان کے اس جہانِ فانی سے گزر جانے تک بطورِ بزرگ بھی ان کا احترام کرتا رہا اور بطورِ شاعر بھی۔ مخلصینِ ادب کے مشاعروں میں آپ میرے استاد نشتر جالندھری مرحوم سے پہلے غزل سرا ہوتے تھے اور ان سے پہلے کبیر خاں رسا جالندھری اپنا کلام سناتے تھے۔ یہ مشاعرے عموماً طرحی ہوتے تھے اور ہر شاعر انتہائی محنت اور کاوش سے اپنی اپنی غزل کہہ کر لاتا تھا۔ اساتذہ حضرات تو بالخصوص ایک ایک قافیہ پر پورا زور صرف کر دیتے تھے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ''شاعر کی اہلیت کا پتہ طرحی مشاعروں میں چلتا ہے'' تو یہ بڑی حد تک درست ہے۔ انہی طرحی مشاعروں میں بعض اوقات ایسے ایسے معرکہ کے اشعار ہو جاتے تھے جو اس دور کے معروف و مشہور شعراء کو بھی نصیب نہ ہوتے تھے مگر یہ چار

دیواری کا مشاعرہ محض چار دیواری تک محدود رہتا۔ ان مشاعروں میں ایک دوسرے پر ہلکی ہلکی چوٹیں بھی ہوتیں مگر معاملہ کبھی بگڑنے نہ پاتا۔ ایک بار میں نے ایک طرحی غزل میں ایک شعر پڑھا کہ ؎

اُن کے در پہ کیوں جائیں وضع دار ہم بھی ہیں
سر کے بل چلے آئیں وہ ہمیں بلائیں بھی

زیبا صاحب نے یہ شعر سنا تو اس کی داد دیتے ہوئے اپنے شاگردوں سے فرمانے لگے کہ ابھی ابھی انہیں ''بزم زیبا'' کی جانب سے دعوتِ مشاعرہ کا رقعہ جاری کریں۔ ہر چند میں نے زیبا صاحب سے کہا کہ حضور! اس شعر سے ہرگز ہرگز میرا یہ مطلب نہ تھا جیسا کہ آپ نے سمجھ لیا' مگر وہ نہ مانے۔ چنانچہ اس کے بعد میں زیبا مرحوم کی ''بزمِ زیبا'' کے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگا۔ میں کوئی آٹھ دس بار ان کی بزم میں شریک ہوا مگر جب بھی شریک ہوا انہوں نے مجھے ایک اعزاز کے ساتھ مشاعرے میں پڑھوایا۔ میں زیبا صاحب کی اس وسیع القلبی سے بہت متاثر ہوا۔ زیبا صاحب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے استاد حضرت نوح ناروی کی طرح محض زبان و بیان کے شاعر ہیں مگر ان کے کلام کے بالاستیعاب مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان عناصر کے علاوہ بھی ان کے اشعار میں فکر و خیال و جذبہ کی کارفرمائی پائی جاتی ہے۔ ان کے ہاں کاٹ دار مصرعے بھی ہیں' الفاظ کا الٹ پھیر بھی ہے' محاورے کی برجستگی اور روزمرہ کی طرفگی بھی ہے' پیتڑے کے شعر بھی ہیں مگر اس طرح کہ شعر کی عمارت محض انہی عناصر پر استوار نہیں کی گئی بلکہ اس کی تہ میں شاعر کی پوری زندگی اپنی مایوسیوں' اپنی ناکامیوں' اپنی خوشیوں' اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ زیبا کا یہ رنگ ان کا اپنا رنگ ہے اور ان کی آواز صاف پہچانی جاتی ہے۔ میں زیبا مرحوم سے' ان کی وفات سے کئی برس پہلے' ان سے ملاقی نہ ہو سکا۔ آخری بار جب ان سے ملا ہوں تو ان کی صحت میں سرِ مُو فرق نہ پایا۔ مرحوم سنِ کہولت کو پہنچنے کے باوجود عمر کے آخری دور میں بھی صحت مند اور چاق و چوبند دکھائی دیتے تھے۔ اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کا وہی انداز تھا جو اس سے بیس پچیس برس قبل تھا۔ آپ درمیانہ قد کے آدمی تھے۔ جسم بھرا ہوا یعنی قدرے بھاری' رنگ سانولا مگر خوبصورت

سفید ڈاڑھی ذرا سی لمبی' سر پر پٹے رکھے ہوئے تھے جو دیدہ زیب تھے۔ اہل لکھنؤ کی وضع کی کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ گرمیوں میں لمبا کرتا' نیچے چوڑی دار پائجامہ اور شیروانی بھی اکثر زیب تن ہوتی۔ میں جب کبھی انہیں ملا' یا مشاعروں میں شعر پڑھتے سنا آپ کو منہ میں پان چباتے ہی دیکھا۔ وہ اپنے ہمراہ ایک ننھی سی تھیلی' جس میں سپاریاں ہوتیں' رکھتے تھے اور اسی طرح کسی چھوٹی سی ڈبیا میں پان بھی رکھتے ہوں گے۔ انتہا درجے کے خوش خلق تھے۔ گفتگو میں پاس رواداری ان کی خاص ادا تھی۔ وہ بات کھلے انداز میں کرنے کے عادی تھے مگر ہنستے ہوئے اور مسکراتے ہوئے۔ موقع محل کے لحاظ سے ترکی بہ ترکی جواب دیتے اور تہ دار جملہ کہنے سے بھی نہ چوکتے تھے۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کا ایک حلقہ قائم کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ متعدد شعرا حضرات اصلاحِ سخن کے سلسلہ میں' ان سے رجوع ہوئے۔ وہ اصلاحِ سخن کے معاملہ میں اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ اُن کے ہاں طرحی مشاعروں کے علاوہ محافلِ مسالمہ بھی منعقد ہوتی رہیں۔ انہوں نے امامِ عالی مقام کی شان میں بہت کچھ کہا اور حقیقت یہ ہے کہ کئی حضرات انہیں شیعہ تصور کرنے لگے تھے۔ مگر ایسا نہ تھا۔ ان کی حیات کے مختلف کوائف یوں ہیں۔ آپ ۱۸۹۴ء میں بمقام قصبہ نارہ' پرگنہ کڑا مانک پور' ضلع اکبر آباد' یوپی میں پیدا ہوئے' آپ کا نام نامی سیّد صغیر حسن اور عرفیت محمد اطہر تھی۔ زیبا تخلص کرتے تھے۔ والد کا نام امیر حسن تھا اور یہ ان کی پہلی نرینہ اولاد تھے۔ آپ دہلی کے مشہور طبیہ کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ اور وہیں سے ۱۹۴۱ء میں طب کی سند حاصل کی۔ اوائل عمر میں محکمہ جنگلات میں ملازمت کر لی تھی اور قریب قریب دس برس تک گورکھ پور کے جنگلات میں بسلسلہ ملازمت مقیم رہے۔ بعدازاں کلکتہ کا رخ کیا اور وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد دہلی واپس چلے آئے۔ ابتدائی عمر کی اس ملازمت کے بعد پھر تاحیات آپ نے آزادانہ زندگی بسر کی۔ متاہل زندگی اختیار کرنے کے بعد آپ کے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے لیکن ان میں سے بیشتر بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ ان میں سے ان کی صرف دو اولادیں زندہ رہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ لڑکے کا نام ابوالبشیر فاطمی اور لڑکی کا نام ممتاز ملکہ ہے۔

جہاں تک آپ کی شاعرانہ زندگی کا تعلق ہے' آپ نے اس کا آغاز ۱۹۱۱ء میں کر

دیا تھا اور حضرت نوح ناروی کے حلقہ تلمذ میں داخل ہو گئے تھے' حضرت نوح ناروی داغ کے ان چار شاگردوں میں شمار ہوتے تھے۔ جو بعدازاں صحیح معنی میں ان کے خلفاء کہلائے۔ یہ حضرات تھے۔

(۱) سائل دہلوی

(۲) آغا شاعر قزلباش

(۳) حضرت بیخود دہلوی

(۴) حضرت نوح ناروی

ان میں کا ہر شاعر' استادانہ درجہ رکھتا تھا۔مگر اصلاحِ سخن کے سلسلہ میں جو درجہ حضرت نوح ناروی کا ہے' وہ اہلِ سخن پر پوری طرح واضح ہے۔ حضرت زیبا ناروی اپنے استاد پر ہمیشہ فخر کرتے رہے اور وہ واقعتاً اس لائق تھے۔ مرحوم ۱۹۲۶ء میں مستقلاً دہلی میں رہائش پذیر ہو گئے تھے اور کوئی دس برس بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں انہوں نے بزمِ زیبا کی بنا ڈال دی تھی جس میں بڑے بڑے شعرا نے شرکت کی۔ تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور چلے آئے اور مرتے دم تک یہیں قیام کیا۔ انہوں نے زندگی کا آخری دور اسلام پورہ' چشتیہ اسٹریٹ' کرشن نگر' میں بسر کیا اور یہیں "بزمِ زیبا" کی محفلیں برپا کیں۔ حضرت نوح ناروی کی وفات کے بعد انہیں استاد کا جانشین مقرر کر دیا گیا تھا اور وہ فی الواقعہ اس قابل تھے' ساری زندگی شعر وشاعری کی نذر کر دی۔

غزل' نظم' قطعہ' رباعی اور دیگر اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے مگر ان کی شاعری کا خاص موضوع غزل ہی رہا۔ غزل میں ان کا اپنا خاص رنگ تھا۔ اس میں وہ اپنے استاد کے رنگ کو بھی برتتے تھے مگر ساتھ ساتھ اپنے خاص انداز کو بھی قائم رکھتے تھے۔ زبان و بیان کی شاعری کے ساتھ ان کے اشعار میں ہلکی ہلکی دل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ مرض الموت میں مبتلا ہونے سے پہلے اُن کی صحت سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ ۹۰ برس کی عمر سے تجاوز کر چکے ہیں۔ لب و لہجہ میں وہی چمک اور چال ڈھال میں کوئی نمایاں فرق دکھائی نہ دیتا تھا۔ افسوس! آپ تین ماہ بیمار رہ کر ۹۳ برس کی عمر میں دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ سچ یہ ہے کہ زیبا مرحوم وضع داری' دہلی کی تہذیب اور شاعری کی صدیوں پرانی روایت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ افسوس

زمانے نے ان کی پذیرائی نہ کی اور یہ گوشہ نشین شاعر اپنی سی گزارنے کے بعد اس بے رحم دنیا سے کوچ کر گیا۔ کسی نے سچ کہا ہے۔

قرن ہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع
عاقلِ کامل شود یا فاضلِ صاحب سخن

نمونۂ کلام

یہاں آج مسکن' وہاں کل ہے مدفن' ازل سے عجب رات دن ہیرا پھیری
یہ دنیا کی دولت' یہ دولت کی دنیا' نہ اِس کی نہ اُس کی نہ میری نہ تیری
اداؤں کی دنیا' جوانی کا عالم' زمانہ ہے تیرا' خدائی ہے تیری
اب ایسے میں جو کچھ گزرتی ہے مجھ پر' سناؤں کسے میں' سنے کون میری
اُدھر بے نیازی اِدھر بندگی میں' اُدھر خود نمائی' اِدھر بے خودی میں
فسانہ فسانہ' فسانہ ہے تیرا۔ کہانی کہانی' کہانی ہے میری
سرِ حشر اب کیا پشیمان ہو تم' نظر کیوں ہے نیچی' ہوئے کس لیے گم
یہاں بھی ستاؤ' ستم دل پہ ڈھاؤ' کرو سخت گیری' دکھاؤ دلیری
جلالِ تسلی نے اوسان کھوئے' نگاہوں نے دیدار سے ہاتھ دھوئے
یہ کیا دیدان کی' یہ کیا سیرِ جلوہ' نہ دل کو تسلی' نہ آنکھوں کو میری
دمِ سیرِ گلشن' کرے غور دنیا' نہ کچھ اور عالم' نہ کچھ اور دنیا
خزاں کی فضا میں' گلوں کی ادا میں' حکایت ہے میری' کہانی ہے تیری
بڑے خود غرض ہو' بڑے مطلبی ہو' نہ سمجھے تھے ہم ایسا بے درد تم کو
یہ کیا دلبری ہے' یہ کیا دل لگی ہے' اِدھر دل اُڑیا' اُدھر آنکھ پھیری
یہ ہے تیرہ بختی' محبت میں زیبا قدم جب کوئی میں نے آگے بڑھایا
اٹھیں ہر طرف خوف ساماں گھٹائیں' نگاہوں پہ چھائی غضب ناک اندھیری

نہ گل تر' نہ بہاریں' نہ گلستاں میرا — میں ہوں زنداں کے لیے اور ہے زنداں میرا
دل گیا' ہوش اڑے' چین لٹا' عقل چھنی — آپ نے لوٹ لیا' لٹ گیا ساماں میرا

پھول کھلنے دو گلستاں میں بہار آنے دو
بڑھ کے مل جائے گا دامن سے گریباں میرا

وہ ابھی پھر نگہِ قہر مرے دل کی طرف
وہ گری برق، ہوا خاک وہ ارماں میرا

گل کھلائے ہیں لہو رو کے مری آنکھوں نے
کوئی دیکھے تو بیاباں میں گلستاں میرا

حلقۂ گیسوئے پیچاں کی اسیری مشکل
یوسفِ عمر نے دیکھا نہیں زنداں میرا

آپ چاہیں تو ابھی دردِ جگر اچھا ہو
غیر ممکن ہے کسی اور سے درماں میرا

میں کسے دوست کہوں؟ کس کو بٹھاؤں دل میں!
سیکڑوں ہاتھ ہیں اور ایک گریباں میرا

کس نے جھیلی ہیں شب و روز جفائیں؟ میں نے!
کس کا الفت میں ہوا حال پریشاں؟ میرا

دل گیا جان بھی ہو جائے گی صدقے زیبا
وہ نظر جانچ رہی ہے ابھی ایماں میرا

آج پردہ سہی، کل پیشِ نظر بھی ہوگا
آئنہ ہے تو کوئی آئنہ گر بھی ہوگا

آسماں سے اتر آئیں گے ہزاروں جگنو
شام ہوتے ہی چراغاں میرے گھر بھی ہوگا

نیند کے بھیس میں آئی ہے شبِ ہجر اجل
دامِ ہم رنگِ زمیں خوابِ سحر بھی ہوگا

قصۂ درد کی سُرخی بھی نمایاں ہوگی
دیدۂ تر سے رواں خونِ جگر بھی ہوگا

نالہ کش ہونے کی دیتے ہو اجازت مجھ کو
یاد رکھنا! مرے نالوں میں اثر بھی ہوگا

بھولی صورت سے ابھر آئے ہزاروں فتنے
کیا خبر تھی، وہ حسیں شعبدہ گر بھی ہوگا

جرأتِ پردہ دری چاہیئے اے ذوقِ نظر!
زیبِ مسند، وہ پسِ پردہ در بھی ہوگا

آ ہی جائے گا کوئی راہ پہ آتے آتے
اک نہ اک روز وہ مہماں مرے گھر بھی ہوگا

باہمی ربط ترے گیسو و رخ کا ہے عجب
ظلمتِ شب میں تماشائے سحر بھی ہوگا

دیکھ کر مجھ کو بصد ناز وہ جس دیتے ہیں
اے جنوں! اُن پہ کبھی ترا اثر بھی ہوگا

سبز پتوں کے مقدر میں کہاں یہ سرخی
شاملِ رنگِ حنا خونِ جگر بھی ہوگا

آپ اٹھیے تو سہی چہرۂ انور سے نقاب
انجمن میں کوئی شائستۂ نظر بھی ہوگا

آئیں گے سامنے زیبا! وہ ضرور آئیں گے
مطمئن سلسلۂ ذوقِ نظر بھی ہوگا

مصنف حزیں کاشمیری

شیخ محمد اکرم صدیقی

(مصنف قیدِ یاغستاں)

احمد معراج

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

اقبالیات

از

مولانا غلام رسول مہر

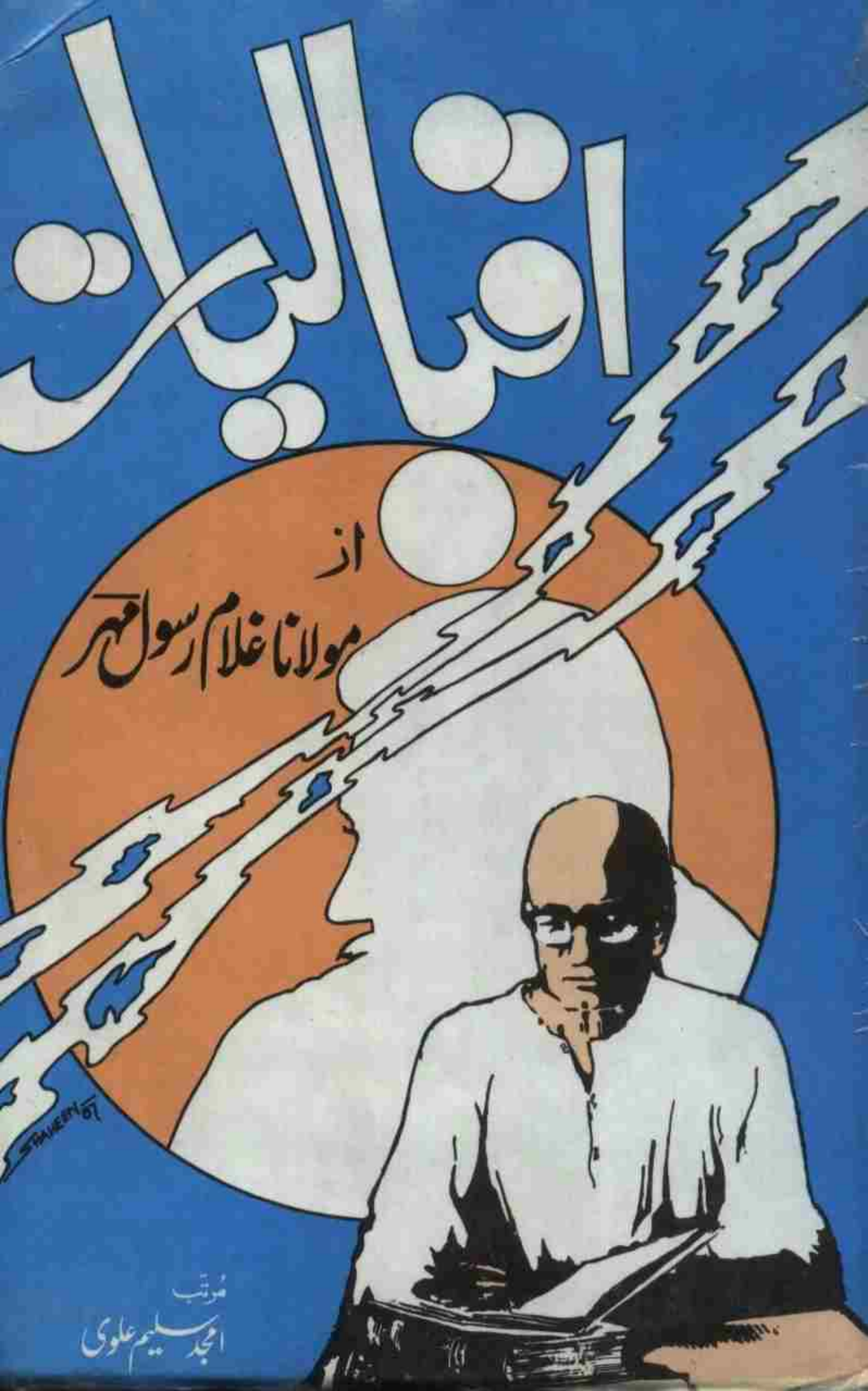

مرتب

امجد سلیم علوی

فہرست مضامین

۱ - پیش لفظ	۵
۲ - علامہ سے تعارف	۷
۳ - علامہ اقبالؒ کی زندگی کا آخری دور	۲۶
۴ - حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ	۴۱
۵ - اقبالؒ کی شخصیت	۴۶
۶ - اقبالؒ دیارِ مغرب میں	۵۰
۷ - کلامِ اقبالؒ کا حقیقی مقام	۵۷
۸ - علامہ اقبالؒ کا نظریۂ حیات	۶۷
۹ - علامہ اقبالؒ اور افریقہ کی آزادی	۷۰
۱۰ - اقبالؒ اور تربیتِ عوام	۸۰
۱۱ - علامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ	۹۱
۱۲ - علامہ اقبالؒ اور مولانا آزادؒ	۹۸
۱۳ - ارمغانِ حجاز کی ایک رباعی کا معاملہ	۱۱۲
۱۴ - شکوۂ اقبالؒ اور جلسۂ انجمن	۱۱۸

۱۵ - خضرِ راہ	۱۲۵
۱۶ - اسرارِ خودی	۱۳۵
۱۷ - پیامِ مشرق	۱۷۵
۱۸ - سرودِ رفتہ	۱۸۱
۱۹ - مکاتیبِ اقبالؒ بنام گرامی	۲۲۵
۲۰ - اقبالؒ درونِ خانہ	۲۳۲
۲۱ - اقبالؒ روزنامچۂ مہر میں	۲۴۸

مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تحریر کا عکس

Ghulam Rasul Mehr

MUSLIM TOWN
LAHORE 1962

ہم بسم اللہ

جائی ۔ مدت مدید سے اس شعر کو پڑھ رہا ہوں مجھ پر اب تک نہ کھلا کہ اس میں کون سی پیچیدگی ہے اور نہ اصل مطلب تک پہنچنے میں کوئی دقت فطرت آتی ہے۔ آپ نے بالکل بجا فرمایا کہ نرگس کی بینائی کا ہزار سال سے ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی بینائی بے نور نہیں ہوئی۔ یہ مضمون شاعر کا اپنا نہیں بلکہ اس نے یہ مضمون اس روایت سے لیا ہے جو اس کے زمانے میں عام تھی۔ اس روایت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مصنف لکھتا ہے "نرگس کا پھول ہر سال ایک بار چمن میں نمودار ہوتا ہے"۔ شاعر کہتا ہے کہ چمن میں دیدہ ور پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔ نرگس کا ہزار سال رونا اس مطلب کے لیے یقینی طور پر سند نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ تو ہوئی اس اعتراض کی کمزوری۔ اب آپ اس سے الگ ہو کر (مضمون پر غور کریں۔ شاعر صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ دیدہ ور کا حصول اتنا آسان نہیں۔ اس مطلب کے لیے اس نے نرگس کا حوالہ دیا۔ اس کی بے نوری کا ذکر کرتے ہوئے اس نے اپنا مدعا ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ [illegible] کہ نرگس کا ہزار سال رونا اس لیے دیدہ ور پیدا کرنا ہے کہ چمن میں دیدہ ور ایسی

پیش لفظ

پیشِ نظر کتاب مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور کے اُن مقالات پر مشتمل ہے جو اُنھوں نے مختلف اوقات میں علامہ اقبالؒ کے متعلق قلمبند کیے۔

اِن میں سے اکثر مقالات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن ان میں سے بیشتر نایاب نہ سہی کمیاب ضرور تھے۔ اور ہر فرد کے لیے ان نوادر تک رسائی ممکن نہ تھی۔ انھیں یکجا کرنے کا احساس مولانا مرحوم کو اپنی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور انھوں نے مضامین کی فراہمی و ترتیب کا فریضہ صاحبزادہ یوسف طاہر صاحب کے سپرد کر دیا تھا جنھوں نے تلاش و ترتیب کا خاصا کام کر لیا تھا مگر مولانا موصوف کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام تشنۂ تکمیل رہ گیا۔

بعد ازاں راقم الحروف نے اِس کام کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا اور خدا کی رحمت سے راقم کی مولانا مرحوم کے بعض غیر مطبوعہ نوادرات تک رسائی ہو گئی، نیز مولانا مرحوم کے متروکہ ذخیرہ میں سے علامہ اقبالؒ کو اٹلی کی حکومت کا جاری کردہ ایک نایاب ریلوے پاس بھی دستیاب ہو گیا جسے شاملِ اشاعت

کیا جارہا ہے۔ یوں ایک ایسا مرقع خوانندگانِ کرام کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے جو مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نگارشات پر مشتمل ہے ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

○

امجد سلیم علوی
خلفِ اصغر مولانا قہرؔ مرحوم
المہر۔ ۳ وحدت روڈ۔ لاہور

۹ نومبر ۱۹۸۷ء

مولانا ابوالکلام آزاد

ایک نادر روزگار شخصیت

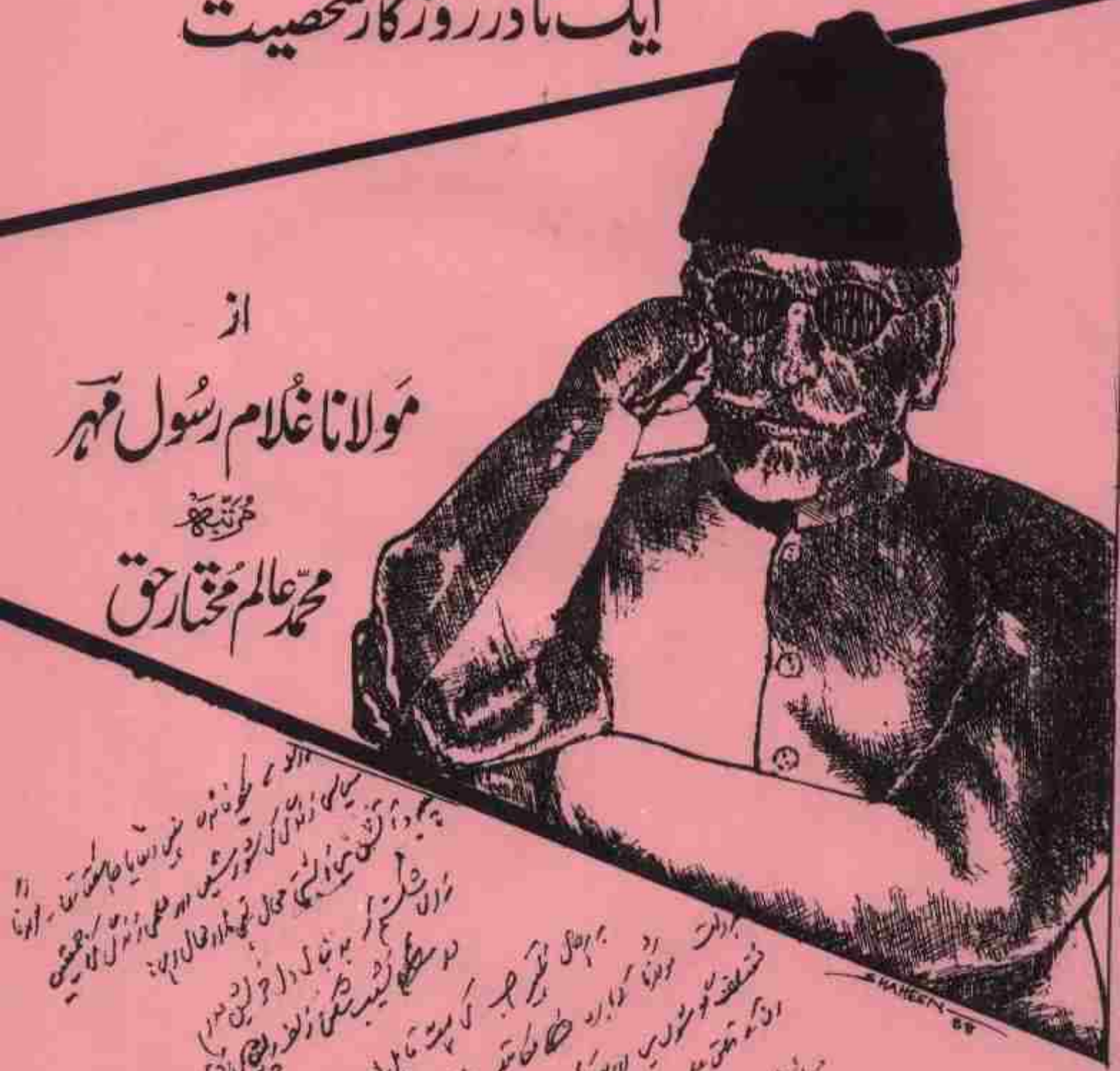

از

مولانا غلام رسول مہر

مرتبہ

محمد عالم مختار حق

فہرست مقالات

۱۔	ابوالکلام آزاد صدی	(مرتب)	صفحہ نمبر ۵
۲۔	مقدمہ	(ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری)	۱۵
۳۔	ابوالکلام آزاد		۶۵
۴۔	آزاد ابوالکلام		۱۰۹
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد کا حسب ونسب		۱۱۷
۶۔	مولانا ابوالکلام		۱۲۶
۷۔	مردِ حق		۱۴۱
۸۔	مولانا آزاد		۱۴۸
۹۔	مولانا آزاد کے بارے میں		۱۶۰
۱۰۔	مولانا ابوالکلام آزاد		۱۶۳
۱۱۔	شخصیت آزاد کی چند جھلکیاں		۱۸۵
۱۲۔	مولانا غلام رسول مہر کا وضاحتی خط		۲۰۱
۱۳۔	مولانا آزاد کی آپ بیتی		۲۰۵
۱۴۔	مولانا آزاد اور آزادیِ ہند کی کہانی (۱)		۲۱۱
۱۵۔	مولانا آزاد اور آزادیِ ہند کی کہانی (۲)		۲۱۷
۱۶۔	مولانا آزاد کا تصورِ حدیث		۲۳۳
۱۷۔	مولانا ابوالکلام آزاد اور اسلام		۲۵۱
۱۸۔	اسلامی انقلاب برپا کرنے والے کردار کے آئینے میں		۲۶۴

"علامہ اقبال اور مولانا آزاد" کے موضوع پر مولانا مہر مرحوم کے دو مقالات "اقبالیات" از مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ میں شامل ہیں۔

ابوالکلام آزاد صدی

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسی عبقری شخصیت تھے جنھیں کارکنانِ قضا و قدر قرن ہا قرن کے بعد کتمِ عدم سے منصۂ شہود پر جلوہ افروز کرتے ہیں اور پھر ایسے مقدس و بابرکت مقام پر جسے قرآن مجید و فرقانِ حمید نے بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ کے نام سے یاد کیا ہے۔ لاریب یہ اسی ارضِ مقدس کا فیضان تھا کہ مولانا کم و بیش نصف صدی تک برصغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی افق پر مہرِ منیر کی طرح ضوفشاں رہے مگر صد حیف کہ ہماری سیاسی وابستگیوں اور اختلافِ فکر و نظر نے مولانا کی عظمت و رفعت کے چاند کو دُھندلا کے رکھ دیا اور ان کے رشحاتِ قلم سے چکیدہ تحریرات سے استفادہ و استفاضہ ہمارے لیے شجرِ ممنوعہ قرار پایا اور یوں ان کے علمی کارنامے تعصبات کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اس حادثۂ فاجعہ پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ آہ! ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

لیکن تمام تر تعصبات اور تنگ نظریوں کے باوجود اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان کی بزمِ علم و ادب اور مجالسِ مذہبی و سیاسی مولانا آزاد کے عادلانہ تذکرے اور محبت آمیز ذکر سے خالی کبھی نہیں رہیں۔ مولانا آزاد کی یاد کو

زندہ رکھنے میں مولانا غلام رسول مہر اور آغا شورش کاشمیری کے نام سرِفہرست ہیں۔
تیسری شخصیت جس نے نہایت عقیدت کے ساتھ مولانا آزاد کی یاد کو سینے سے لگائے رکھا اور جس کی زبان و قلم نے مولانا آزاد کی یاد اور ان کے فضائل و محاسن کے تذکرے سے کبھی غفلت نہیں برتی، ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کی ہے اور اب تو ہماری قومی زندگی کے حوادث و واقعات نے ملک کے ہر سنجیدہ شخص کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر کسی دور میں ہم مولانا کی رہنمائی سے محروم ہو گئے تھے تو آخر اس کے اسباب کیا تھے اور مولانا آزاد کا روانِ ملت کو کس طرف لے جانا چاہتے تھے کہ ہم نے ان کی رہنمائی قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان حالات نے مولانا آزاد کے افکار کے مطالعہ اور سیرت کے خصائص و محاسن کی جستجو کی ایک تحریک پیدا کر دی ہے۔

مولانا کی ولادت باسعادت (اگست ۱۸۸۸ء) کے اعتبار سے مولانا کا صد سالہ یوم پیدائش، جسے "آزاد صدی تقریبات" کا نام دیا گیا، ۱۹۸۸ء میں منایا گیا۔ اس سلسلے میں حکومتِ ہند نے ایک قومی کمیٹی تشکیل دی جس کے چیئرمین سابقہ وزیر اعظم ہند راجیو گاندھی اور سیکرٹری خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈائریکٹر اے آر بیدار تھے۔ اس کمیٹی کے ذمہ مولانا کے شہرۂ آفاق جرائد الہلال، البلاغ، پیغام وغیرہ کی عکسی اشاعتیں اور مولانا کی حیات بابرکات اور کارناموں پر ایک جامع اور باتصویر کتاب کی طباعت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا کی ذاتی استعمال کی اشیاء کو محفوظ کرنے کیلئے بھی بعض انتظامات کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں متعدد اداروں نے اپنے طور پر اور حکومت کے تعاون سے متعدد سیمینار منعقد کئے، ایک خاصی تعداد میں کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی اور کئی سرکاری اداروں کے علمی مجلّوں کے خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے ہیں۔

حکومت کی سطح پر مولانا آزاد کی یاد منانے کی تو ہرگز توقع نہ تھی لیکن بعض

سیاسی و مذہبی اداروں اور جماعتوں مثلاً جمعیت علمائے اسلام، مجلس احرار اسلام، جماعت اہلحدیث وغیرہ کی طرف سے توقع تھی کہ وہ مولانا کی یاد منانے کا کوئی اہتمام ضرور کریں گے لیکن ہمیں ایسی کسی کوشش کا علم نہیں ہو سکا البتہ مولانا کے بعض مخلصین اور اصحابِ دانش نے اپنے طور پر ان کی یاد منانے کا انتظام ضرور کیا اور آزاد صدی کے حوالے سے اتنا کام کر دکھایا جسے مجموعی طور پر حکومتِ ہند کے کام کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ کام "آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان، کراچی" نے انجام دیا جس کے رُوحِ رواں بلکہ "خود گُوزہ و خود گُوزہ گر و خود گِلِ گوزہ" کے مصداق برادرم ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری صاحب ہیں جنھوں نے تن من دھن لگا کر اب تک اکیس کتابیں چھاپ کر اہالیانِ وطن کی طرف سے بالعموم اور "ابوالکلامیوں" کی طرف سے بالخصوص یہ فرض کفایہ ادا کر کے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ مناسب ہوگا کہ اس موقع پر آزاد صدی کی نسبت سے پاکستان اور ہندوستان میں ہونے والے علمی کارناموں کا سرسری تعارف کرا دیا جائے۔

ا: (ا) مطبوعات آزاد نیشنل کمیٹی پاکستان:

١۔ مولانا ابوالکلام آزاد (شخصی مطالعہ) — ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی
٢۔ امام الہند مولانا آزاد — مولانا امداد صابری
٣۔ اردو کا ادیبِ اعظم (مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے مضامین، شذرات، تبصرے، تقاریر اور دونوں بزرگوں کے مابین مراسلت)
٤۔ خطوطِ ماجدی — مولانا عبدالماجد دریابادی
٥۔ ابوالکلام آزاد — عبداللہ بٹ
٦۔ آسپکٹس آف ابوالکلام آزاد

انہی سے رنگِ گلستاں

مولانا غلام رسول مہر

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز

PJL 1591

ترتیب

- دیباچہ 9
- ۱۔ حضرت زینبؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ (۶۰۰ء۔۶۳۰ء) 13
- ۲۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ (۵۷۳ء۔۶۳۴ء) 16
- ۳۔ حضرت عمر فاروقؓ (۵۸۱ء۔۶۴۴ء) 21
- ۴۔ حضرت خنساء (۵۹۴ء۔۶۴۴ء) 27
- ۵۔ عبدالرحمٰن الداخل اُندلسی (۷۳۱ء۔۳۰ ستمبر ۷۸۸ء) 31
- ۶۔ حضرت ربیعہ (.....؟۔۶۹۴ء) 40
- ۷۔ سلطان محمود غزنوی (۲ نومبر ۹۷۱ء۔۳۰ اپریل ۱۰۳۰ء) 43
- ۸۔ شیخ علیؒ ہجویری (.....؟۔۱۰۷۲ء) 52
- ۹۔ امام غزالیؒ (۱۰۵۸ء۔۱۱۱۱ء) 58
- ۱۰۔ شہاب الدین محمد غوری (.....؟۔۱۲۰۶ء) 65
- ۱۱۔ کمال الدین اسماعیل اصفہانی (.....؟۔۱۲۳۱ء) 72
- ۱۲۔ لسان الدین ابن الخطیب اُندلسی (۱۳۱۳ء۔۱۳۷۴ء) 76
- ۱۳۔ ابنِ بطوطہ (۱۳۰۴ء۔۱۳۷۷ء) 80
- ۱۴۔ ابنِ خلدون۔ فلسفۂ تاریخ کا امام (۲۷ مئی ۱۳۳۲ء۔۱۹ مارچ ۱۴۰۶ء) 84
- ۱۵۔ شاہ اسماعیل صفوی (۱۷ جولائی ۱۴۸۷ء۔۲۳ مئی ۱۵۲۴ء) 98
- ۱۶۔ خیرالدین باربروسا (۱۴۷۸ء۔۴ جولائی ۱۵۴۶ء) 102
- ۱۷۔ شیخ الاسلام سید علی ترمذی (۱۴۹۴ء۔۸۵/۱۵۸۴ء) 110

۱۸۔ سعداللہ خاں وزیراعظم ہند (۱۶۰۹ء۔۹/اپریل ۱۶۵۶ء) 118

۱۹۔ میر محمد رضی دانش مشہدی (.....؟۔۱۶۶۶ء) 137

۲۰۔ جہاں آرا بیگم (۲۳ مارچ ۱۶۱۴ء۔۱۶ ستمبر ۱۶۸۰ء) 140

۲۱۔ شاہِ عالمگیر گردوں آستاں (۲۴/اکتوبر ۱۶۱۸ء۔۲۱ فروری ۱۷۰۷ء) 147

۲۲۔ میرزا عبدالقادر بیدل (۱۶۴۴ء۔۲۴ نومبر ۱۷۲۱ء) 165

۲۳۔ سراج الدین علی خاں آرزو (۱۶۸۸ء۔۱۷۵۶ء) 180

۲۴۔ صمصام الدولہ شاہ نواز خان مؤلف مآثر الامرأ (۹ مارچ ۱۷۰۰ء۔۱۲ مئی ۱۷۵۸ء) 208

۲۵۔ شاہ ولی اللہ مُحدّث دہلوی (۱۰ فروری ۱۷۰۲ء۔۱۰/اگست ۱۷۶۲ء) 216

۲۶۔ میر حسن (۱۷۳۶ء۔۱۷۸۶ء) 229

۲۷۔ کشن کماری 235

۲۸۔ تیرھویں صدی ہجری کے دو مجاہد (سید احمد شہید ۱۷۸۶ء۔۶ مئی ۱۸۳۱ء) 242

(شاہ اسماعیل شہید ۲۹/اپریل ۱۷۷۹ء۔۶ مئی ۱۸۳۱ء)

۲۹۔ احمداللہ شاہ مدراسی (۱۷۹۰ء۔۱۴ جون ۱۸۵۸ء) 259

۳۰۔ جنرل بخت خاں (.....؟۔۱۸۵۹ء) 267

۳۱۔ مہدی سوڈانی (۱۸۴۸ء۔۲۲ جون ۱۸۸۵ء) 274

۳۲۔ سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء۔۹ مارچ ۱۸۹۷ء) 287

۳۳۔ سرسید احمد خاں (۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء۔۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) 295

۳۴۔ وقارالملک (۱۴ مارچ ۱۸۴۱ء۔۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء) 301

۳۵۔ شیخ الہندؒ اور تحریکِ آزادیٔ وطن (۱۸۵۱ء۔۱۹۲۰ء) 313

۳۶۔ حضرت طبیب الملک حکیم اجمل خاں کی سیرت (۱۸۶۴ء۔۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء) 319

۳۷۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم و مغفور (۱۸۶۴ء۔۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء) 323

۳۸۔ شہیدِ ملت رئیس الاحرار (۱۸۷۸ء۔۴ جنوری ۱۹۳۱ء) 328

۳۹۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم (۱۸۷۸ء۔۴ جنوری ۱۹۳۱ء) 331

۴۰۔ رئیس الاحرار کی ایک جھلک (۱۸۷۸ء۔۴ جنوری ۱۹۳۱ء) 335

۴۱۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی۔اسلامیت و آزادی کا جانباز مجاہد (۱۸۷۸ء۔۴ جنوری ۱۹۳۱ء) .. 339

۴۲۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم (۱۸۷۸ء۔۴ جنوری ۱۹۳۱ء) 347

۴۳۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی نظامی مرحوم (۱۸۷۰ء۔۱۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء) 350

۴۴۔ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم (۱۸۷۰ء۔۱۶/اکتوبر ۱۹۳۷ء) 357

۴۵۔ کمال اتاترک (۱۹ مئی ۱۸۸۱ء۔۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) 362

۴۶۔ کمال اتاترک (۱۹ مئی ۱۸۸۱ء۔۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء) 367

۴۷۔ مولانا مظہر الدین شہید (.....؟۔۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء) 373

۴۸۔ میری والدہ (.....؟۔۲۳/اگست ۱۹۴۱ء) 378

۴۹۔ حضرت مولانا عبدالقادر قصوری رحمۃ اللہ (.....؟۔۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء) 394

۵۰۔ مولانا عبدالقادر قصوریؒ اور کانگرسی ہندو (.....؟۔۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء) 398

۵۱۔ مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم و مغفور (۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء۔۲۲/اگست ۱۹۴۴ء) 400

۵۲۔ قائدِ اعظمؒ (۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء۔۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء) 404

۵۳۔ عبدالعزیز فرمانروائے دولتِ سعودیہ (۱۸۸۰ء۔۹ نومبر ۱۹۵۳ء) 412

۵۴۔ جلالت الملک عبدالعزیز مرحوم و مغفور (۱۸۸۰ء۔۹ نومبر ۱۹۵۳ء) 421

۵۵۔ تاج الدین زرین رقم مرحوم (.....؟۔۱۳ جون ۱۹۵۵ء) 431

۵۶۔ پروفیسر سید عبدالقادر مرحوم (۸۶/۱۸۸۵۔۲۲ جنوری ۱۹۵۶ء) 433

۵۷۔ عقیدت کے چند پھول۔مولانا ظفر علی خاں کی بارگاہِ عظمت میں (۱۸۷۳ء۔۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء) .. 439

۵۸۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم و مغفور (۱۸۷۳ء۔۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء) 441

۵۹۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء) 449

۶۰۔ مولانا ظفر علی خاں (۱۸۷۳ء۔۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء) 457

۶۱۔ پطرس بخاری (۱۸۹۸ء۔۱۹۵۸ء) 459

۶۲۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔وہ چراغ بھی بجھ گیا (۱۸۹۵ء۔۲۴ جون ۱۹۵۹ء) ... 465

۶۳۔ حضرت سالکؔ کی خدمت میں گلدستۂ عقیدت (۱۲ ستمبر ۱۸۹۴ء۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) .. 473
۶۴۔ مولانا عبدالمجید سالکؔ (۱۲ ستمبر ۱۸۹۴ء۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء) 477
۶۵۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری (۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء۔ ۲۱/ اگست ۱۹۶۱ء) 480
۶۶۔ وہ آدمی تھا مگر (۲۳ ستمبر ۱۸۹۲ء۔ ۲۱/ اگست ۱۹۶۱ء) 488
۶۷۔ مولانا محمد شفیع مرحوم و مغفور (۷/ اگست ۱۸۸۳ء۔ ۱۵ مارچ ۱۹۶۳ء) 494
۶۸۔ پنڈت جواہر لال نہرو (۱۴ نومبر ۱۸۸۹ء۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء) 500
۶۹۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم و مغفور (۲۵ مارچ ۱۹۰۲ء۔ ۱۴ جون ۱۹۶۴ء) 504
۷۰۔ عزیز بھٹی شہید (۶/ اگست ۱۹۲۳ء۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء) 509
۷۱۔ مولوی شمس الدین مرحوم و مغفور (۱۹۱۶ء۔ ۱۱ جنوری ۱۹۶۸ء) 516
۷۲۔ میرا بھائی (۱۹۰۰ء۔ ۷ مارچ ۱۹۶۹ء) 522
۷۳۔ جنرل اختر حسین ملک (۱۹۱۷ء۔ ۲۲/ اگست ۱۹۶۹ء) 539
۷۴۔ سید امتیاز علی تاج مرحوم (۱۳/ اکتوبر ۱۹۰۰ء۔ ۱۸/ اپریل ۱۹۷۰ء) 544
۷۵۔ جمال عبدالناصر (۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء) 551
۷۶۔ جمال ناصر کے جنازے کا ایک منظر (۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ء) 556
۷۷۔ سید عابد علی عابدؔ مرحوم (۲۱ ستمبر ۱۹۰۶ء۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء) 560
۷۸۔ میاں عبدالعزیز مرحوم (۱۹/ اگست ۱۸۷۲ء۔ ۲۸ جولائی ۱۹۷۱ء) 566
۷۹۔ راشد منہاس شہید، نشانِ حیدر (۷ فروری ۱۹۵۱ء۔ ۲۰/ اگست ۱۹۷۱ء) 572
۸۰۔ جوش ملسیانی (یکم فروری ۱۸۸۴ء۔ ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء) 574
۸۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی (۱۸۹۲ء۔ ۶ جنوری ۱۹۷۷ء) 600
۸۲۔ پروفیسر اللہ بخش آرٹسٹ (۱۸۹۲ء۔ ۱۹۷۸ء) 605
۸۳۔ الحاج شیخ مبارک علی تاجرِ کتب (۱۸۹۲ء۔ یکم اپریل ۱۹۸۳ء) 624
۸۴۔ میاں ایم۔ اسلم (۱۸۸۵ء۔ نومبر ۱۹۸۳ء) 643
۸۵۔ شیخ نیاز احمد (۱۹۱۹ء۔ ۱۷ نومبر ۲۰۰۸ء) 649
۸۶۔ مولانا غلام رسول مہرؔ (بقلم خود) 657
۸۷۔ اشاریہ 665

دیباچہ

میرے والدِ ماجد مولانا غلام رسول مہر مرحوم و مغفور بیک وقت صحافی بھی تھے اور مؤرخ بھی، محقق بھی تھے اور سوانح نگار بھی، شاعر بھی تھے اور مترجم بھی۔ کمال یہ ہے کہ ہر شعبے میں وہ بلند پائے پر فائز رہے۔ سوانح نگاری سے انھیں خصوصی لگاؤ تھا۔ مولانا مہر دسمبر ۱۹۲۱ء سے اکتوبر ۱۹۴۹ء تک تقریباً اٹھائیس سال تک روزانہ صحافت سے وابستہ رہے۔ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں روزنامہ ''انقلاب'' کی بندش کے بعد تصنیف و تالیف اور تراجم کے لیے وقف ہو گئے لیکن اس دور میں بھی انھوں نے چار اور پانچ سو کے درمیان مضامین مختلف اخبارات و رسائل کے لیے لکھے۔ ان میں لگ بھگ ایک تہائی مضامین کا تعلق سوانح نگاری سے ہے۔ علامہ اقبال اور مولانا آزاد پر مولانا مہر کے لکھے گئے مضامین کے مجموعے ''اقبالیات'' اور ''مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک نادرِ روزگار شخصیت'' کے عنوانات کے تحت شائع ہو چکے ہیں۔ غالب پر مولانا مہر نے درجنوں مضامین لکھے جنھیں الگ کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔

اس مجموعے میں شامل مضامین نومبر ۱۹۲۲ء سے نومبر ۱۹۷۱ء تک کے طویل دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ ''زمیندار'' اور ''انقلاب'' کے مضامین الگ حیثیت رکھتے ہیں اور انھیں علیحدہ طور پر ہی شائع ہونا چاہیے۔ میں نے زمیندار کا ایک اداریہ اس مجموعہ میں شامل کیا ہے جو مولانا عبدالمجید سالک مرحوم و مغفور کی جیل سے رہائی کے موقع پر لکھا گیا تھا۔ نیز ایک نظم شاملِ مجموعہ ہے جو مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے استقبال کے لیے لکھی گئی جب وہ چار سال کی جیل کاٹ کر رہا ہوئے۔ ''انقلاب'' سے صرف انہی شخصیات پر مضامین کتاب میں شامل کیے گئے جن پر مولانا نے ''انقلاب'' کی بندش کے بعد بھی مضامین لکھے۔ مقصد یہی تھا کہ ان شخصیات پر مولانا کی تحریریں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔ مولانا عبدالقادر قصوری اور مولانا عبیداللہ سندھی پر مولانا مہر کے تعزیتی اداریوں کے اقتباسات ماہنامہ ''الولی''، حیدرآباد اور ''تحریکِ نظمِ جماعت'' (مرتبہ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری) میں چھپ چکے تھے۔ انھیں مکمل صورت میں اس مجموعے میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا۔

اس مجموعے میں اکیس مضامین ایسے شامل ہیں جو پہلے کہیں شائع نہیں ہوئے اور پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ ان میں چند مضامین مولانا نے اپنی زندگی کے آخری دو تین سالوں میں لکھے۔ زیادہ تر غیر مطبوعہ مضامین غالباً ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں کے دوران لکھے گئے جب لاہور کے گلی کوچے فسادات کی زد میں تھے اور اخبار چند ہفتے بند رہا تھا۔ ان مضامین کا ذکر مولانا کے روزنامچوں میں بھی ملتا ہے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۱ کو مولانا نے لکھا:

''پرانے مقالے دیکھے تاکہ اگر کہیں ترمیم کی ضرورت ہو تو کر دوں یہ ذخیرہ بہت طویل ہے اور خاصا وقت لے گا۔''

یکم اپریل ۱۹۷۱ء کو مولانا رقمطراز ہیں:

''آج سارا دن ان مقالوں کے پڑھنے میں گزار دیا جو مدت سے الگ لفافے میں بند تھے اور ایک دو کے سوا تمام مقالے دیکھ گیا البتہ بعض پر ذیلی عنوان نہ لگا سکا۔ یہ کام بھی ان شاء اللہ کسی روز مکمل کر دوں گا۔

ایسے تمام مضامین کے آخر میں ''غیر مطبوعہ'' کی تصریح کر دی گئی ہے۔

غیر مطبوعہ مضامین کے مسودات زیادہ تر پنسل سے تحریر ہوئے ہیں اور جو مضامین قلم سے لکھے گئے ان میں بھی کہیں کہیں سیاہی پھیکی پڑ جانے کے باعث چند الفاظ واضح طور پر پڑھے نہ جا سکے۔ چند مضامین کے کچھ حصے دیمک کی نذر ہوئے اور اس خلا کو سیاق و سباق کو دیکھتے ہوئے میں نے پُر کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں نقل میں مجھ سے کوتاہی سرزد ہوئی ہو۔ کتاب کے مضامین میں کسی مقام پر ابہام محسوس ہو تو اسے میری نالائقی سمجھا جائے۔ اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کی تمام مضامین مولانا مرحوم کے الفاظ میں ہی نقل ہوں لیکن کسی بھی سہو کے لیے عفو خواہ ہوں۔

مضامین کی ترتیب میں دو پہلو پیشِ نظر تھے۔ اولاً یہ کہ مضامین کو اس ترتیب سے شائع کیا جائے جس ترتیب سے یہ مضامین لکھے گئے۔ ثانیاً، شخصیات کی اپنی زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے۔ میں نے دوسرے طریقے پر عمل کرنا اس لیے بھی مناسب سمجھا کہ اس طرح متقدمین اور معاصرین کا تفاوت از خود واضح ہو جائے گا۔

میں سب بہن بھائیوں میں چھوٹا ہوں اور میرے شوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سب بڑے بہن بھائیوں نے از راہِ شفقت و محبت، جو الحمد للہ مجھے ہمیشہ حاصل رہی، والدِ ماجد کے تمام مسودات، نیز ذخیرۂ مکاتیب اور روزنامچے میرے سپرد کر دیے تھے۔ موجودہ کتاب کی ترتیب میں مجھے اپنے پاس موجود نوادراتِ مہر سے بہت مدد ملی۔

لیکن میرے لیے مخدومی مولانا محمد عالم مختار حق صاحب کا شکریہ ادا کرنا لازم ہے جنھوں نے ابا جان مرحوم و مغفور کی وفات کے بعد بھی ہمیشہ مجھ سے رابطہ رکھا اور اسی طرح مہینے میں ایک یا دو مرتبہ ہمارے گھر آ کر میری رہنمائی فرماتے رہے جس طرح ابا جان کی زندگی میں ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ انھیں کے مشورے پر میں نے اپنے پاس موجود ابا جان کے مضامین اور کتب کی فہرست بنائی۔ والدِ ماجد کے متعلق جو بھی نئی چیز شائع ہوتی، عالم صاحب اس کا ایک فاضل نسخہ میرے لیے ضرور خرید لیتے تھے۔ عالم صاحب کے دیے ہوئے عطیات کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کی تفصیل یہاں درج کرنا ممکن نہیں۔ اس کتاب میں شامل چند مضامین کی عکسی نقول بھی مجھے عالم صاحب نے مرحمت فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ شفقت مجھ عاجز پر قائم رکھیں، آمین!

مخدومی ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری صاحب کی شفقت اور رہنمائی بھی مجھے اس پورے دور میں حاصل رہی ہے۔ ''مولانا ابوالکلام آزاد۔ ایک نادرِ روزگار شخصیت'' کا مبسوط مقدمہ ڈاکٹر صاحب ہی کے قلم سے نکلا ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پر ابا جان کے مضمون کی عکسی نقل بھی مجھے ڈاکٹر صاحب ہی نے عنایت فرمائی۔ شکر گزار ہوں کہ میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود وہ مجھ سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔

گوجرانوالہ کے جناب ضیاء اللہ کھوکھر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ میں نے جب بھی کسی مضمون کے سلسلہ میں ان سے استفسار کیا، انھوں نے اپنے کتب خانے سے مطلوبہ مضمون تلاش کر کے عکسی نقل مجھے بھجوا دی۔ رسائل کا شاندار ذخیرہ انھوں نے جمع کر رکھا ہے اور شائقینِ علم کو خوشہ چینی کا موقع وسیع القلبی سے فراہم کرتے ہیں۔ شبیر میواتی صاحب بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں کہ ان کو جہاں کسی مضمون کا سراغ ملا، انھوں نے مجھے باخبر کیا نیز چند مضامین کی عکسی نقول بھی فراہم کیں۔

عجائب گھر اور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے کتب خانوں سے بھی میں نے استفادہ کیا۔ مولانا مہر کی وفات کے بعد ان کا ذاتی کتب خانہ اور روزنامہ ''انقلاب'' کے فائل عجائب گھر لائبریری کے حوالے کر دیے گئے تھے۔ اس کتب خانے میں میرا اکثر جانا ہوتا ہے اور محمد اقبال بٹ صاحب ہمیشہ بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ ریسرچ سوسائٹی کے کتب خانے میں ''زمیندار'' کا چھ سالہ فائل (۱۹۲۱ تا اوائل ۱۹۲۷) اور ''انقلاب'' کا تقریباً مکمل ریکارڈ محفوظ ہے۔ ان دونوں اخبارات کے فائل اور تحریکِ پاکستان سے متعلق قیمتی مطبوعہ مواد ۱۹۶۵ میں میرے والدِ ماجد نے ریسرچ سوسائٹی کے سپرد کیا تھا اور سوسائٹی نے مکمل فہرست ''مہر کلیکشن'' کے نام سے مولانا کی زندگی

ہی میں شائع کر دی تھی۔ ریسرچ سوسائٹی کے سربراہ ڈاکٹر سید قلب عابد کی مہربانی سے مجھے اس کتب خانے سے استفادے کا موقع ملا۔ میں دونوں کتب خانوں کے کارپردازوں کا شکر گزار ہوں۔

میرے بھتیجے نعیم اسلم (خلف الرشید عبدالسلام اسلم مرحوم) نے چند نادر تصاویر فراہم کیں جو اس کتاب کی زینت ہیں، نیز اپنے پاس موجود نوادراتِ مہر بھی میرے حوالے کر دیے۔ نعیم میاں سے میرا تعلق ایسا ہے کہ ان کے لیے ممنونیت کا اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمارے درمیان محبت اور یگانگت ہمیشہ اسی طرح قائم رکھے۔ آمین۔

اس مجموعے کی ترتیب کا آغاز چار ساڑھے چار سال پیشتر ہوا تھا جب پروفیسر اللہ بخش آرٹسٹ کے خاندان کے چشم و چراغ عبدالخالق آرٹسٹ میرے پاس تشریف لائے۔ ان کی فرمائش پر میں نے پروفیسر اللہ بخش صاحب پر ابا جان کا لکھا ہوا مضمون نکالا۔ مولانا مہر کی تحریر پڑھنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ میں نے فل سکیپ کے کاغذوں پر مضمون نقل کیا۔ میری اپنی تحریر اتنی ناپختہ ہے کہ ان کو اپنا لکھا مضمون دینے میں شرم محسوس ہوئی لہٰذا مضمون کمپوزنگ کے لیے دے دیا۔ کمپوزنگ کی غلطیاں درست کرتے ہوئے خیال آیا کہ بیس بائیس مضامین کا مجموعہ ترتیب دے لینا کیا مشکل ہے۔ مضامین بھی میرے پاس موجود تھے۔ یوں اس مجموعہ مضامین کی داغ بیل پڑی۔ جو فرض مجھے بہت پہلے ادا کر دینا چاہیے تھا، عبدالخالق صاحب کی تحریک اس فرض کی ادائیگی کا باعث بنی۔

جو کام میری نظر میں چند ہفتوں کا تھا، وہ پھیلتا چلا گیا۔ تلاش اور جستجو سے کتنے ہی مضامین دستیاب ہو گئے اور آج ۸۵ مضامین کا مجموعہ شائقینِ علم و ادب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ اس مجموعے کے کمپوزر محمد انور صاحب بک ہوم سے وابستہ ہیں۔ جس صبر و تحمل سے پچھلے چار سال سے یہ سارا مواد اپنے کمپیوٹر میں سنبھالے بیٹھے ہیں، اس کرم فرمائی کے لیے میں ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

انتہائی عاجزی سے اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالاتا ہوں کہ آج ایک فرض ادا ہوا۔ میری کوشش ہوگی آئندہ ہر سال کم از کم ایک کتاب ضرور مولانا غلام رسول مہر کے نوادرات میں سے منظرِ عام پر آتی رہے، ان شاء اللہ۔

امجد سلیم علوی

۵۱۲۔ بلاک جی ۴

محمد علی جوہر ٹاؤن لاہور ۵۴۷۷۰

۲۲ فروری ۲۰۱۱ء